لہ دعوۃ الحق
قرآن و سنت کی تعلیمات کا علمبردار

فون نمبر دار العلوم — ۴
فون نمبر دھالنٹی — ۲

ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک

جلد نمبر : ۷ — مدیر — ربیع الاول ۱۳۹۲ھ
شمارہ نمبر : ۸ — سمیع الحق — مئی ۱۹۷۲ء

اس شمارے میں

ناشر : سمیع الحق استاد دار العلوم حقانیہ — مقام اشاعت : دفتر الحق دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک
طابع : منظور عام پریس پشاور — پرنٹر : محمد شریف — کتابت : اصغر حسن

مغربی و مشرقی پاکستان سے سالانہ ۸ روپے — قیمت فی پرچہ ۷۵ پیسے — غیر ممالک بحری ڈاک ایک پونڈ، ہوائی ڈاک ڈیڑھ پونڈ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ آغاز

قومی اسمبلی کے پہلے اجلاس میں اکثریتی پارٹی کی اسلامی آئین سے جو سرد مہری دیکھنے میں آئی اس سے مایوسی کا بڑھ جانا تعجب خیز نہیں۔ اب آئینی کمیٹی مستقل رپورٹ تیار کر رہی ہے۔ مگر کیا کمیٹی کی سفارش مسلمانوں کے جذبات کو ملحوظ رکھ سکے گی۔ اور کیا قدرت کے عظیم تر تازیانہ "سقوطِ مشرقی پاکستان" سے کچھ عبرت لی جائے گی۔؟ بظاہر کوئی ایسی امید لگانا خوش فہمی ہی معلوم ہوتی ہے، مگر اللہ تعالیٰ مقلب القلوب ہے کیا عجب پردۂ غیب سے کچھ اصلاح کا سامان ہو جائے۔

★

صوبہ سرحد میں جمعیۃ العلماء اسلام اور نیشنل عوامی پارٹی کے باہمی تعاون سے جمعیۃ کی وزارت قائم ہو چکی ہے۔ اور جمعیۃ العلماء اسلام کے قابلِ فخر قائد مولانا مفتی محمود صاحب وزارتِ اعلیٰ کے منصب پر فائز ہو چکے ہیں۔ مفتی صاحب اولو العزم لیڈر ہونے کے ساتھ ساتھ جیّد عالم، فقیہ اور عالم باعمل ہیں۔ سیاسی بصیرت اور تدبر، تحمل اور بردباری ان کی معروف صفات ہیں، علماء حق کو حکومت اور قیادت کی توفیق میسر ہونے پر ہم حضرت مفتی صاحب کو مبارکباد بلکہ دلی دعائیں پیش کرتے ہیں۔ کہ اس نازک اور عظیم آزمائش پر حق تعالیٰ ان کی دستگیری فرمائے اور وہ اپنے رفقائے کار کے ساتھ مل کر یہاں ایک ایسا مثالی معاشرہ اور خوشحال صوبہ تعمیر کر سکیں جو پورے ملک کے لئے ایک قابلِ تقلید نمونہ ثابت ہو۔ اگر اس مرحلہ پر ہماری یہ کوششیں کامیابی سے ہمکنار ہو سکیں، اور ہم ناسازگار حالات اور طرح طرح کی مشکلات اور رکاوٹوں کو سرخروئی کے ساتھ پار کر سکیں۔ تو اس طرح پورے ملک میں دینی قیادت اور اسلامی نظامِ حکومت کے فروغ کی راہ ہموار ہو سکے گی۔ حضرت مفتی صاحب نے حلفِ وفاداری اٹھانے کے بعد ام الخبائث شراب پر مکمل پابندی کا اعلان کر دیا اور دیوانی و فوجداری قوانین کو کتاب و سنت کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے ایک بورڈ کا بھی۔ اور معاشرہ کی مکمل تطہیر کے عزائم بھی ظاہر فرمائے۔ یہ دیکھ کر رقت انگیز منظر تھا جو مدتوں بعد اس چمن کو دیکھنا نصیب ہوا۔ کتنی آنکھیں اس موقع پر فرطِ مسرت سے آبدیدہ ہو گئیں اور ملک کے کونے کونے میں اسلامی درد سے لبریز کتنے دلوں کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

واقعی مسرتوں کا مقام ہے ــــ خزاں رسیدہ گلشن محمدی میں بہار آنے کے تصور سے بھی تو مسلمان کے تن مردہ میں جان آجاتی ہے۔ پھر کیا عجب ان سنگلاخ پہاڑیوں اور خشک و بے آب صحراؤں میں چمنستان اسلام کی شادابیاں لوٹ آئیں اور دین محمدی کی خشک کھیتیاں سید احمد شہیدؒ اور ان کے رفقاء جان نثار کے خون کی طرح لالہ زار بن جائیں۔ آئیے صدق دل سے بارگاہ ایزدی میں گڑگڑا کر سرحد میں جمعیۃ العلماء اسلام کی حکومت کی کامیابی، مضبوطی، استحکام جادہ حق پر صبر و ثبات اور توفیق ایزدی کے لئے دعا کریں کہ یہ آزمائش مسرتوں اور خوشیوں کے ساتھ ساتھ مشکلات اور خطرات سے بھی لبریز ہے ـــــــــــ

ـــــــ ★ ـــــــ

چاروں صوبوں میں صوبائی اسمبلیوں نے کام شروع کر دیا ہے۔ جمہوری عمل کا آغاز اطمینان اور مسرت کا باعث ہے۔ انتخاب کے فوراً بعد ہم اپنی جمہوری راستوں پر گامزن ہو جاتے تو بہت اچھا ہوتا مگر ماشاء اللہ کان وما لم یشاء لم یکن۔ اگر اب بھی اس راہ سے ہم بچے کھچے پاکستان کی حفاظت کر سکیں تو غنیمت ہے ــــــــــ

ـــــــ ★ ـــــــ

آہ مولانا فخر الدین مراد آبادی مرحوم | ایک اخبار نے آل انڈیا ریڈیو کے حوالہ سے معلوم ہوا ہے کہ رونق آرائے مسند دار الحدیث دیوبند شیخ الحدیث بقیۃ السلف مولانا سید فخر الدین احمد مراد آبادی پچھلے ماہ واصل بحق ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ دار العلوم کی وہ آخری شمع بھی بجھ گئی جس کے انوار دار الحدیث سے نکل اکناف عالم کو منور کر رہے تھے بظاہر اب صدارت دار العلوم کی وہ مسند علم و فضل خالی ہو گئی جو ہمیشہ سے اپنے دور کے برگزیدہ صرف شخصیتوں کے لئے مختص رہی مولانا مرحوم کی ولادت ۱۳۰۷ھ میں بمقام اجمیر ہوئی۔ ابتدائی تعلیم خاندانی بزرگوں سے پائی پھر گلاؤٹھی اور دہلی سے ہوتے ہوئے شوال ۱۳۲۶ھ میں مرکز علوم دیوبند میں داخل ہوئے حضرت شیخ الہندؒ سے دورۂ حدیث پڑھا پھر ان ہی اکابر کے حکم پر ۱۳۲۸ھ میں مدرسہ شاہی مراد آباد میں تدریس شروع کی تعلیم و ارشاد ہی کی خاطر بڑی سے بڑی تنخواہ کو ٹھکرا دیا۔ مگر اس مدرسہ کو نہ چھوڑا اس دوران تدریس کے علاوہ باطل مذاہب کے تعاقب اور مناظرہ میں بھی میدان ان کے ہاتھ رہا۔

۱۳۷۷ھ میں شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ فوت ہو گئے تو انہیں جانشین بنا کر دار العلوم بلایا اور بخاری کا درس دیتے رہے۔ ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں بھی حضرت شیخ الاسلام مرحوم کی ناموس کا

شرف پایا پھر ان کے وصال کے بعد ۱۳۷۷ھ سے لیکر وفات تک دارالعلوم کے شیخ الحدیث اور صدر رہے۔ ۱۳۷۷ھ سے صرف ۱۳۸۲ھ تک آپ سے ۱۱۹۱ طلبہ نے بخاری شریف پڑھی، زہد وورع، اخلاص وللہیت، ثقاہت، تبحر اور اتباع سنت جیسی صفات عالیہ کی بناء پر اہل علم کے مرجع رہے۔ ۱۳۸۲ھ میں ہفت عشرہ کیلئے ناچیز کا دیوبند جانا ہوا، تو دو ایک روز درس بخاری کی شرکت کی سعادت بھی پائی۔ اپنی قیام گاہ مدنی منزل جہاں حضرت "مستقل مقیم" تھے میں حضرت کا قرب ملا۔ اور اس اثناء میں میری خواہش پر تبرکاً سند حدیث سے بھی سرفرازی بخشی اور مولانا اسعد مدنی مدظلہ وغیرہ کی موجودگی میں ناچیز اور رفیق عزیز مولانا عبداللہ کاکاخیل کو تبرکاً بخاری شریف شروع کرائی سیاسی زندگی میں حضرت شیخ الاسلامؒ کے ہم مسلک وہم مشرب رہے اور اس راہ میں قید وبند کی صعوبتیں اٹھائیں۔ حضرت شیخ الاسلامؒ کے بعد جمعیۃ العلماء ہند کے صدر رہے۔ ظاہر کی باطن جیسا تابناک اور تابدار تھا، نور مجسم دکھائی دیتے۔ افسوس کہ آپ کی جدائی سے گلشن علم و دین دارالعلوم دیوبند کے خزاں میں اور بھی اضافہ ہوگیا ؎

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل ۔

سمیع الحق

الحق کتاب وسنت کا ترجمان اور دارالعلوم حقانیہ کا علمی ارگن ہے۔
الحق کو ملت کے ہر طبقہ کے عوام وخواص کا تعاون حاصل ہے۔
الحق علماء، تجار، صنعت کار، سیاستدان اور جدید تعلیم یافتہ حضرات میں یکساں مفید ہے
الحق کے مضامین دینی واصلاحی نقطہ نظر کے حامل ہوتے ہیں
الحق وقتی جریدہ نہیں، اسکی ہمہ جہتی اور افادیت حال و مستقبل میں ہمیشہ محسوس ہوگی۔
الحق سفید کاغذ اور معیاری کتابت وطباعت اور آرٹ پیپر کے ٹائیٹل کیساتھ
انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے۔
الحق آپ کا اپنا پرچہ ہے اسکی توسیع اشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیجئے۔

کو نشستیں اور کونسل لیگ سے متعلق حضرات اس معاملہ میں کامل متفق تھے۔ مولانا ہزاروی نے میرے
خیال میں علماء کی نہیں بلکہ اپنی پارٹی اور منصب اقتدار کی پر زور وکالت فرمائی تھی۔

بہرحال ان حضرات نے مختلف مواقع پر اس "اختلاف" کی قلعی کھول دی اور آخری دن جب
شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب مدظلہ نے اپنی تقریر میں تمام منسوب اختلافات کی طرف سے مسلم کی متفقہ
تعریف پیش کی اور ایمان سے اضطراب پر ایوان کے واقعی بازو نے بھی خاموشی اختیار کرکے نیم رضا کا
اظہار کیا تو عملاً اس چیلنج کا جواب ہوگیا۔

تقریر کے بعد مولانا شاہ احمد نورانی و محمود اعظم صاحب فاروقی اور دوسرے حضرات نے بھی
مولانا کی تقریر کو سراہا۔ کراچی کے مولانا ازہری نے تو باقاعدہ اپنی پریس کانفرنس میں بھی اس اتحاد و یکجہتی
کا ذکر کیا۔ ان کے اخبار المدینہ نے جلی سرخیوں کے ساتھ شائع کرکے اس سے اتفاق کیا۔ منسوب اختلافات
کا مرثیہ حضرت خان عبدالولی خان اور سردار شوکت حیات کی قیادت میں علماء کرام کا محاذ رہا۔ اور یہ ان علماء
کی بڑی کامیابی ہے۔ بالخصوص قائد جمعیۃ العلماء اسلام مولانا مفتی محمود اور مولانا ہزاروی کی مدبرانہ سیاست کی
اس "اختلاف" کے پروپیگنڈہ کے شر سے خیر کا ایک پہلو یہ سامنے آیا کہ بار بار مرزائیت اور کیمونزم
کے بارہ میں علماء کرام کو اپنا فریضہ ادا کرنے کا موقع مل گیا۔

ختم نبوت کے ذکر سے ایوان کے در و دیوار گونج اٹھے۔ مولانا غلام غوث ہزاروی نے
نہایت جذبات میں اعلان کیا کہ جو کچھ بھی ہو ہم ہرگز یہ برداشت نہیں کریں گے۔ کہ پاکستان کی صدارت
پر کوئی مرزائی یا کیمونسٹ قبضہ کرسکے۔

پیپلز پارٹی کے ملک جعفر صاحب (جن کے مرزائی ہونے کی شہرت تھی) جب اپنی تقریر
میں نہایت گستاخی سے اسلامی اقدار کی دھجیاں اڑا رہے تھے اور پاکستان کا نام سوشلسٹ ریاست
رکھنے پر زور دے رہے تھے۔ تو ان کی زبان سے بھی نکلا کہ آپ کی بحث سے علماء کی طرف سے بہرحال
یہ بات ظاہر ہوگئی ہے کہ کم از کم کیمونسٹ اور احمدی کے کافر ہونے پر یہ لوگ متفق ہیں۔

آگے چل کر اس اجماع سے فرار کے لئے کہا گیا کہ ۱۹۵۹ء کے آئین میں بھی مسلم ہونے کی شرط ذاتی
اور اصولاً ان کے بنیادی حقوق کے منافی بات ہے۔ لیکن شاید ملک جعفر صاحب کو معلوم نہ تھا کہ مولانا
ہزاروی کی جماعت تو اس آئین کی اسی وجہ ہی سے مخالفت کرتی چلی آرہی ہے۔ آگے چل کر ملک جعفر صاحب
نے فرمایا کہ اس مسئلہ پر کہ کون مسلمان ہے، کون نہیں، ملک میں بالخصوص پنجاب (تحریک ختم نبوت)
میں بہت بڑا فساد ہوا ہے جس کے ہم متحمل نہیں ہو سکتے ..... ملک صاحب کا خطرہ بجا ہے۔ لیکن علماء تو تم

کی تعریف اور وضاحت پر زور دے کر ایسے ہی خطرات کا سدِّباب کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے علاوہ برصغیر میں مسلمانوں کی جداگانہ مسلم حیثیت کا تعین اور تشخص ہی تو ہے جو پچھلے سو سال سے مسلمانوں کے مختلف سیاسی اور آئینی مسائل اور بحرانوں سے نکالنے کا ذریعہ بنتا چلا آرہا ہے۔ برصغیر کے خاص حالات جہاں مسلمان اقلیت میں تھے اس کی بات متقاضی رہتے کہ نہ صرف ہندو اور انگریز کے مقابلہ میں مسلمانوں کو اپنا ملی وجداگانہ حیثیت ثابت کرنا پڑا جو بالآخر تقسیم ملک اور قیام پاکستان کا ذریعہ بلکہ یہاں اسلام کے نام پر اٹھنے والی ان تمام تحریکوں کو اس جداگانہ امتیاز کی بدولت نبرد آزما ہونا پڑا جو سنت نبویؐ سے فرار اور ختم نبوت کے عقیدہ سے گریز پر مبنی تھے اگر مسلمان اس جداگانہ حیثیت پر اصرار نہ کرتے تو نہ پاکستان بن سکتا، اور نہ ہم یہاں اسلام کی امتیازی شکل برقرار رکھ سکتے۔ دیگر اسلامی ممالک کو ان مشکلات کا سامنا نہیں تھا اس لئے انہوں نے مسلمان کی آئینی اور سیاسی تعریف و تشریح کو ضروری نہ سمجھا ہوگا۔ مگر یہ بات نہ صرف یہاں کی سیاسی اور آئینی ضرورت ہے بلکہ ملت کے اتحاد، بقاء اور سالمیت کے لئے ریڑھ کی ہڈی جیسی اہمیت رکھتی ہے۔ فساد اور تباہی کا اندیشہ اس کی تشریح کی صورت میں نہیں بلکہ مبہم اور مجمل رکھنے کی صورت میں ہے کہ اس طرح مرزائی کیمونسٹ یا دوسرے غیر مسلم افراد چور دروازوں سے ملک کے کلیدی مناصب پر فائز ہو سکیں گے۔ ملک جعفر کی یہ بات بھی بڑی عجیب تھی کہ اگر صدر کا مسلمان ہونا ہم عوام پر کیوں نہ چھوڑیں؟ اور بقول افتخار الدین اس معاملے کو آئینی حیثیت دینا عوام کی ہتک ہے۔ کیا ملک صاحب عوام کو یہ حق دے سکتے ہیں کہ حکومت اور صدر مملکت کے اختیارات، دیگر انتظامی امور اور بنیادی حقوق سے متعلق دفعات بھی عوام ہی پر چھوڑ دیں۔ اور اسی طرح تمام اقتصادی اور معاشی اصلاحات یا دیگر سماجی خرابیوں کا ازالہ اور اچھے برے کی تمیز بھی آئینی اور دستوری تحفظ کی بجائے عوام کی قوت تمیز پر چھوڑا جائے۔ کیا اس دلیل سے پورا آئین اور اس کا جبری نفاذ یا قانون کی بالادستی عوام کی ہتک نہیں ہو سکتی ہے؟

ہمارے وزیر قانون صاحب کی بھی اسی طرح کی ایک مضحکہ خیز بات اخبارات میں آئی ہے، کہ نماز روزہ شراب زنا یعنی جن باتوں کا ذکر قرآن میں ہے اسے ہم آئین میں شامل نہیں کر سکتے۔ ع

خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا کہئے

ملک جعفر صاحب نے اپنی تقریر میں علماء کے کسی خاص بورڈ یا مشاورتی کونسل کے قیام پر بھی کڑی تنقید کی اور حوالہ دیا پچھلے کئے گئے ایسے تجربات کا جو فائدہ مند ثابت نہ ہوسکے، لیکن ملک صاحب یہ بھول گئے کہ پچھلے تجربات "علماء حق اور دین کیلئے فائدہ مند ثابت نہ بھی ہوئے مگر شراب جوا اور سود

" حلال کرکے " ملک صاحب جیسے لوگوں کیلئے تو بہرحال سود مند رہے۔ ایسی ناشکری اپنے محسنوں کی اور راستے بھرے ایران میں آج مساوات قسم کے جرائد میں شراب کی حلت پر جو دلائل اور مضامین آ رہے ہیں وہ تو فضل الرحمان اور اس قماش کے محققین کی قے لگتا ہے جسے چاٹ چاٹ کر ملت کے حق نا توان کی فذائیت کا سامان ہو رہا ہے۔ ملک جعفر صاحب اور ان کے ہمنوا لوگوں کے لئے یہ بات بڑی خطرناک تھی کہ ایسا بورڈ اگر بنتا ہے اور اس میں حسب دستور قومی اسمبلی کے رکن ہی لئے جا سکیں گے تو یہ منتخب علماء جن میں فضل الرحمان جیسے لوگ نہیں مل سکتے۔ صحیح نہج پر کام کرنے لگ جائیں گے۔ اس لئے ملک صاحب نے اس بات پر خاص زور دیا کہ اگر ایسا کوئی رکن بورڈ میں شامل ہوتا ہے تو اسکی رکنیت اسمبلی ختم کر دی جائے ــــــــ۔

اس مرحلہ پر ہمارے مرد قلندر مولانا غلام غوث صاحب سے نہ رہا گیا، اور پوائنٹ آف آرڈر پر اٹھ کر کہا ــــ کہ جناب صدر میں اس میں یہ اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ اگر کوئی رکن مرزائی ہے تو اسکی ممبری بھی ختم کر دی جائے۔ اس پر ملک صاحب خفیف سے ہو کر بیٹھ گئے اور ساری گھن گرج کی ہوا مولانا نے ایک ہی نشتر سے نکال دی۔

پیپلز پارٹی کے ڈاکٹر محمود بخاری نے بھی مسلمان کی تعریف کے مسئلہ پر مخالفانہ نقطہ نظر پیش کیا، وہ اور ان کے ہمنوا اس بات پر خاصے برہم تھے کہ اس طرح اختلاف و انتشار کو ہوا دیکر اسلام کے ایک مستقل فرقہ (مرزائیت) پر حملے کر کے فرقہ بندی کو ہوا دی جا رہی ہے۔ مگر علماء کسی طرح بھی ایک ایسے فرقہ کو اسلامی فرقہ کہنے پر تیار نہ تھے جسے متفقہ طور پر اسلام سے خارج قرار دیا گیا ہے۔ بخاری صاحب نے "مسلمان" کا ایک ایسا مفہوم مختلف حوالوں سے پیش کیا گویا تیمم نہ بود گنج خدا بود۔

ایک دفعہ مسلمان کہلانے کے بعد کفر و الحاد کی کوئی ایسی بات نہ رہی جو اس مفہوم میں سما نہ سکے۔ اسمبلی میں بخاری صاحب کوثر نیازی صاحب کے ہم نشین تھے۔ ان کی تقریر کے دوران مولانا شاید اتفاق سے غائب تھے۔ مگر بخاری صاحب کی غلط سلط عربی اسماء کلمات کا تلفظ اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ یہ باتیں ان کے لئے نئی ہیں۔ اور مولانا نے جاتے جاتے حق جوار ادا کرتے ہوئے انہیں کچھ نہ کچھ القاء کرا دیا ہے۔ اس خیال کا اظہار ایک موقعہ پر بخاری صاحب سے میں نے کر بھی دیا مگر وہ ہنسی میں ٹال گئے اور کہا کہ وہ خود اس موضوع پر ایکسپرٹ ہیں۔ بخاری صاحب نے اپنی تقریر میں اس بات پر بھی زور دیا کہ موجودہ آئین پچھلے تمام دساتیر سے زیادہ اسلامی ہے۔

وزیر قانون صاحب نے ایک مرتبہ آئین میں شراب کی ممانعت کی بجائے حوصلہ شکنی کی تاویل میں

کہاکہ جب قرآن میں صریح ممانعت کے باوجود لوگ اس پر عمل نہیں کرتے تو آئین میں آجانے سے کیا فرق پڑیگا تو علماء کی جانب سے فوراً کہا گیا کہ پھر تو جوا پر پابندی کے تکلف بیجا کی کیا ضرورت ہے، جبکہ اس کا ذکر بھی قرآن میں موجود ہے، اس کا جواب حزب اقتدار کی جانب سے نہ ہوا۔

خواتین ارکان نے تقریباً یک زبان ہو کر حقوق کے نام پر مغرب زدگی کا مظاہرہ کیا اور آزادی وا باحیت کے وہ تمام تیر چلائے جو بار بار استعمال کی وجہ سے کند ہو چکے ہیں۔ بیگم نسیم جہان نے کہاکہ ہمیں مغرب زدہ کہا گیا ہے، مگر کیا یہ مغرب زدہ لاؤڈ سپیکر ٹھیک کام نہیں کر رہا —؟ پھر تان مولوی بیچارے پر ٹوٹی اور کہاکہ اس طرف بیٹھنے والے احباب (علماء) محسوس نہ کریں۔ ان کا شغل ہی تکفیر ہے۔

کمال اتاترک، سرسید علامہ اقبال اور ہمارے بھٹو صاحب پر بھی کفر کا فتویٰ صادر کر دیا گیا ہے۔ اسلام میں ملائیت کی گنجائش نہیں۔

اس مرحلہ پر پھر مولانا غلام غوث اُٹھے اور کہا: محترمہ سر چھپا کر بات کریں اس ایوان کے احترام کی خاطر ہی ——۔

آگے چل کر محترمہ نے کہا جوا اور شراب کی بات کرنے کی بجائے سرمایہ داری اور اجارہ داری پر توجہ دینی چاہئے۔ آج بھٹو صاحب کی اصلاحات کی وجہ سے ہم پر نکتہ چینی کی جا رہی ہے، مگر ہم بیدار ہو گئی ہیں۔ استحصال قبول نہیں کریں گی۔ پھر آگے چل کر "لاجواب" بات کہی کہ علماء کی ایسی ہی تعبیرات کی وجہ سے بنگلہ دیش نے سیکولرزم قبول کر لیا ہے۔ سپیکر نے کہا محترمہ یہ جنگ آج ختم نہیں ہو گی۔ مگر وہ کہتی جا رہی تھیں کہ عورت، اپنے مقام پر تب پہنچے گی کہ اس کی زنجیریں ٹوٹ جائیں اور پورا سوشلسٹ نظام اپنایا جائے۔

ایک دوسری خاتون بیگم عباسی بھی اٹھیں اور عورتوں کے استحصال کا رونا رویا مولانا ہزاروی سے رہا نہ گیا اور اٹھ کر سپیکر صاحب سے مخاطب ہوئے: صدر صاحب یہ عورتوں کا استحصال کیا معنی؟ اسکی تشریح کی جائے۔ ایک زبردست قہقہہ سے ایوان کشت زار زعفران بنا نہ صرف اسمبلی کے چیرمین صاحب بلکہ پورا حزب اقتدار بھی مولانا کی اس معصومیت سے بھرپور طنز سے محظوظ ہونے لگا۔ مولانا کی آواز پھر گونجی۔ محترم! یہ غریبوں کا استحصال تو سنتے آتے ہیں، یہ زنانہ استحصال کیا ہوتا ہے۔ پورا ایوان لوٹ پوٹ ہو گیا۔ اور بولنے والی محترمہ خفیف ہو کر کہنے لگیں۔ ہم تو غریب ہیں مردوں کے رحم و کرم پر ہیں۔ مگر مولانا کی اس طنز میں تو عورتوں پر اس رحم و شفقت کا ایک دریا موجزن تھا جو اسلام نے عورتوں کے لئے ضروری قرار دیا ہے۔ استحصال کہاں ہوتا ہے، کلب میں جب وہ شمع

محفل بن گئی، فلموں میں جب وہ زینت پردہ بن گئی پبلسٹی میں جب اسے بلکاڈنال کے پہلو میں جگہ دی گئی مگر آہ اس استحصال میں وہ ایسی جذب ہو گئی کہ نجات کی ہر آواز کو صدائے قید و بند سمجھنے لگی۔ اور آج وہ اسی نام پر اپنے استحصال کیلئے کھلی چھوٹ مانگ رہی ہے۔

پشاور کی مسلم لیگی خاتون ممبر بیگم شیریں وہاب نے عورتوں کے حقوق پر زور دیا مگر منہ سے ایسی معقول بات بھی نکلی کہ استحصال کا سارا جرم کمول دیا۔ عائلی قوانین نے عورتوں کو جن آلام و مصائب میں ڈال دیا ہے ایک ہی دار میں اس کا کام ختم کر دیا۔ کہنے لگیں کہ تعدد ازدواج پر پابندی نے مردوں کو مجبور کر دیا ہے کہ دوسری شادی کی خاطر وہ پہلی بیوی کو اگرچہ وہ کئی بچوں کی ماں کیوں نہ ہو، طلاق دیدے اور نئی شادی کیلئے راستہ نکالدے۔

یہ ایک جھلک تھی اس نظریاتی کشمکش کی جو اسمبلی میں دیکھنے میں آئی۔ صدر مملکت کے وسیع اختیارات، بنیادی حقوق، صوبائی خود مختاری کے صدود مارشل لا کی دفعات کا تحفظ نیم صدارتی و پارلیمانی آئین، مرکز میں وفاقی پارلیمانی نظام، ان سب چیزوں پر بھی بحث مباحثہ ہوا، مگر زیادہ تر آئین کی اسلامی دفعات اور اسلامی حیثیت ہی زیر بحث رہے۔ شراب، فحاشی، ریس اور سود کی عدم ممانعت، عائلی قوانین کی غیر اسلامی دفعات کا تحفظ ملک کا سرکاری مذہب اسلام ہو، مسلمان کی تعریف اور کتاب و سنت کے منافی قوانین کو ختم کرنے کی مدت کا تعین نہ ہونے کے بارہ میں جمعیۃ العلماء اسلام کی ترامیم شامل نہیں کی گئیں۔ نہ دیگر علماء کی متفقہ تنقید کو خاطر میں لایا گیا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ آئین پر رائے شماری میں حصہ ہی نہ لیا جاتے اور بڑی خوشی کی بات ہے کہ اس معاملہ میں حزب مخالف کی ساری جماعتیں مکمل طور پر متفق رہیں۔ قبائلی آزاد ممبر جو الیکشن سے نہیں سیلیکشن سے ایوان میں آتے ہیں، زیادہ تر حزب اقتدار کے "استحصال" کا شکار رہے۔ اور "مضبوط مرکز" کے علمبردار خان قیوم صاحب نے تو ہر معاملہ میں "فل سپورٹ" بننے کی اتنی کوشش کی کہ گیلری میں بیٹھے ہوئے بعض تماشائی تو انہیں "فل سپورٹ" کے نام سے یاد کرنے لگے۔ تاہم قبائلی ارکان آئین پر رائے شماری میں حزب اختلاف کے ساتھ بیٹھے رہے اور عجیب گومگو کے عالم میں۔ ادھر یہ اپنے لوگ عوام سے اسلامی آئین کے سلسلہ میں جمعیۃ العلماء اسلام کی حمایت کے وعدے کر چکے تھے۔ اُدھر "استحصال" کے شکنجہ میں کسے ہوئے تھے۔ پھر بھی قبائلی رہنما ملک جہانگیر خان صاحب نے کچھ حد تک یہ کہہ کر وعدہ کو نبھانا چاہا کہ ہم سات ارکان نے قوم سے اسلامی آئین نہ بننے کی صورت میں واپس ہو جانے کا وعدہ کیا۔ اور ہم اس

صورت میں ایوان چھوڑ بھی سکتے ہیں۔ ملک نعمت اللہ خان شنواری نے بھی کہا کہ آئین کی اسلامی حیثیت کے بارہ میں ہم مفتی محمود اور مولانا عبدالحق صاحب کی رائے کے ساتھ ہوں گے۔ اب دیکھنا ہے کہ مستقل آئین کی تدوین کی صورت میں یہ وعدہ کیسے شرمندۂ ایفاء ہوتا ہے۔ مجموعی حیثیت سے ایوان پر کون چھایا رہا اور کون پس منظر میں اس کا فیصلہ عوام پر چھوڑ دینا بہتر ہے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ ایوان میں علماء کی شکل میں وقار اور تقدس کی جھلکیاں نظر آنے لگیں۔ جبہ و دستار، متشرع چہرے، اور نماز کے وقت نماز کا اہتمام اور رسم تعزیت کے لئے کھڑے ہونے کی بجائے رسم فاتحہ خوانی۔ اور بعض تقریروں میں حمد و صلوٰۃ یہ باتیں نئی تھیں مگر ایک خوش آئند تبدیلی کی علامت۔ پہلے دن عصر کے وقت مفتی محمود صاحب نے نماز کے وقفہ کے لئے نکتہ اعتراض اٹھایا، اجلاس ملتوی ہو گیا۔ عصر کو نیچے لابی میں مولانا عبدالحق صاحب نے اور مغرب کو مولانا مفتی محمود صاحب نے جماعت پڑھائی۔ گو شرکت کرنے والے ۲۰، ۲۵ سے متجاوز نہ ہوئے مگر اس کا فائدہ یہ ہوا کہ صدر پاکستان نے تقریر شروع کرنے سے قبل اعلان کیا کہ نماز مغرب کے لئے تقریر روک دی جائے گی۔ (جاری ہے)

ضبط : سمیع الحق ایڈیٹر الحق

قومی اسمبلی
میں
اکابر جمعیۃ العلماء اسلام
کی
تقریریں

شیخ الحدیث مولانا عبدالحق

قائد جمعیۃ مولانا مفتی محمود

حضرۃ مولانا غلام غوث ہزاروی

مولانا عبدالحکیم ہزاروی

دین کی اعلاء و سربلندی کیلئے قومی اسمبلی کے مختصر سیشن میں اکابرین جمعیۃ العلماء اسلام نے دیگر دینی درد رکھنے والے حضرات اور جماعتوں سے ملکر جو کوششیں کیں اسکی کچھ جھلکیاں ان تقاریر میں دیکھی جاسکتی ہیں، جو اس شمارہ میں دی جارہی ہیں۔ ان تقاریر کو اسمبلی کے دوران ایڈیٹر الحق نے قلمبند کیا۔ افسوس کہ سرکاری ذرائع ابلاغ نے اسے صحیح طور پر نشر نہیں کیا ———— سمیع الحق

شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب

—— ۱۱ اپریل ۷۲ء ——

(حمد و ثنا کے بعد) جناب چیئرمین صاحب ! اس معزز ایوان پر دو قسم کی ذمہ داریاں ہیں۔ ایک تو اللہ مالک الملک کی جانب سے ہم پر ذمہ داری ہے اور وہ یہ کہ ہمیں اس اقتدار کی کرسی پر لاکر جانچنا چاہتا ہے کہ میرے ان بندوں کا جن کو ڈیڑھ سو برس بعد غلامی سے نجات دی گئی ہے۔ آزادی کے بعد ان کا سلوک ان کا طریقۂ عبدیت اور ان کا شکر مولیٰ کے کرم کے مطابق ہے یا نہیں اور دوسری ذمہ داری خدا کی مخلوق کی جانب سے ہے کہ ہم نے ان سے وعدہ کیا اور کچھ ذمہ داریاں اپنے اوپر ڈالدیں کہ ہم مظلوموں کی اور ان لوگوں کی جن کی حق تلفیاں ہوئی ہیں۔ ان کے حقوق کی ادائگی کے لئے کیا کچھ کرتے

ہیں اور وہ کس طرح ادا کی جائیں۔

خداوند کریم کا ماننا اور اس کو حاکم اعلیٰ ماننا ہی ایمان ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ ان الحکم الا للّٰہ حکومت اور حاکمیت صرف اللہ جل مجدہ کی ہے۔ اور ہم لوگ بلکہ روئے زمین کے تمام باشندے بالخصوص مسلمان ان سب کی حیثیت تنفیذ احکام کرنے والوں کی ہے۔ اللہ کے احکام کی تنفیذ کرانا ہمارا فرض ہے۔ نبی کریمؐ نے تنفیذ کے ساتھ ان احکام کی تشریح بھی کی ہے۔

کل لفظ مسلمان پر لے دے ہو رہی تھی اور ایک مطالبہ ہوا تھا کہ اگر ہم مسلم ہیں تو مسلم کی تعریف کیا ہے؟ (اور کہا گیا تھا کہ اسکی تعریف پر اتفاق نہیں ہو سکتا۔ اس لئے دستور میں اس کی تعریف شامل نہیں کی جاسکتی۔) تو گذارش ہے کہ مسلم ایک ایسا لفظ تو ہے نہیں جس کا کوئی مفہوم ہی نہ ہو، اور مہمل لفظ ہو۔ اگر ایسا ہوا تو گویا دنیا کے اسی کروڑ مسلمان ایک مہمل لفظ کے مصداق ہوں گے۔ (اور یہ ایک مضحکہ خیز بات ہے) رہا یہ کہنا کہ اس کی تفسیر اور تعریف میں اختلاف ہے (تو یہ ایک مغالطہ ہے) حقیقت یہ ہے کہ اس کی تعریف میں کوئی اختلاف نہیں۔ ایمان اور اسلام کا مفہوم سب کو معلوم ہے کہ التصدیق بجمیع ماجاء به النبی صلی اللہ علیہ وسلم

> یہ ایمان خدا اور اس کی مخلوق کیطرف سے عائد ذمہ داریاں پوری کرے۔ مسلمان کی تعریف پر علماء متفق ہیں۔ اس لئے آئین میں مسلمان کی تعریف لازمی ہے۔ (مولانا عبدالحق)

اردو میں مسلمان کی تعریف یہ ہے کہ وہ شخص جو وحدانیت پر یقین رکھتا ہو اور کتاب و سنت یعنی قرآن مجید، احادیث اور ضروریات دین کی تصدیق کرتا ہو پیغمبر کے تمام جمیعات پر یقین کرنا اور حضورؐ کو آخری نبی ماننا یہی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی شخص کو نہ بروزی نہ ظلی نہ تبعی نہ مستقل کسی قسم کی نبوت نہیں مل سکتی جسطرح دنیا میں آخری اور سب سے کامل روشنی آفتاب کی ہے، اس کے اوپر کوئی روشنی مادیات میں نہیں نہ اس کے بعد کسی روشنی کی ضرورت ہے۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کالشمس فی نصف النہار ہیں ان کے بعد کسی کو نبوت نہیں ملے گی۔ اور اس کے بعد کتاب و سنت اور ضروریات دین کا وہی مفہوم ماننا ہو جس پر خیر القرون کا اتفاق رہا یعنی اب کوئی شخص صلوٰۃ و زکوٰۃ کا معنی اپنی طرف سے نہیں کر سکتا۔ صحابہ کرام کے زمانہ میں تابعین کے دور میں جو مفہوم تھا۔ ان تمام مفاہیم کو اسی طریق پر ماننے والا ہے مسلمان۔

بہرحال ضروریات دین پر یقین اور محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی ماننا لازمی ہے۔ پہلے

سے جن حضرات کو نبوت ملی، جیسے حضرت عیسیٰ، وہ اگر قیامت سے پہلے تشریف لائیں تو ان کو نبوت پانچسو برس پہلے مل چکی ہے، ان کا آنا اس کے منافی نہیں آپکے بعد قیامت تک کسی کو نبوت نہیں دی جائے گی۔
پس جبکہ ہمارے آئین میں یہ دفعہ رکھی گئی ہے کہ ملک کا سربراہ مسلم ہوگا تو ہم آپ کی وساطت سے اپنے معزز وزیر قانون سے استدعا کرتے ہیں کہ یہاں علماء کے جتنے طبقے موجود ہیں سب کو اس مفہوم پر میرے ساتھ متفق پائیں گے اس لئے اگر ہم نے آئین میں مسلمان کی تعریف کا معاملہ طے کر دیا تو بہت سی مشکلات اور مسائل سے نکل جائیں گے۔ (حضرت کی تقریر کو صرف پانچ چھ منٹ گذرے تھے اور کئی اہم امور پر گفتگو باقی تھی کہ اسپیکر نے وقت ختم ہونے کا اعلان کرکے تقریر ختم کر دی۔ حضرت نے اس کے بعد سوالیہ انداز میں ایوان سے اس تعریف پر رائے معلوم کرنا چاہی جس پر تمام حزب اختلاف نے مکمل اتفاق ظاہر کیا اور حزب اقتدار نے خاموشی اختیار کی۔)

مولانا مفتی محمود صاحب

پارلیمانی لیڈر جمعیۃ العلماء اسلام

(۱۷ر اپریل ۷۲ء)

جناب صدر آج جبکہ ہم اس ایوان میں جمع ہیں، عبوری آئین پر بحث ہمارے لئے بڑی مشکل ہے۔ ہمارے لئے اس آئین کی ہر دفعہ کی حمایت ممکن نہیں ہے اس لئے کہ دفعات میں بہت سی خامیاں موجود ہیں اور اگر اس آئین کی مخالفت کریں تو ادھر مارشل لاء کی تلوار بھی ہمارے سروں پر لٹک رہی ہے۔ اگر آئین پاس ہوتا ہے تو مارشل لاء یہاں سے ہٹتا ہے اور نجات ملتی ہے۔ اور اگر پاس نہ ہوا تو نہ معلوم کتنی مدت اور بھی قائم رہتا ہے۔ بہرحال پھر بھی جو خامیاں ہمیں نظر آتی ہیں اسکی نشاندہی اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

> عبوری آئین نہ اسلامی ہے نہ جمہوری۔
> مذہبی عقیدے سے مقدم ہوتے ہیں
> قانون بعد میں آتا
> ہے

جناب صدر ہم سمجھتے ہیں کہ اس ملک کو بنتے وقت یہ نعرہ لگایا گیا تھا کہ پاکستان کا مطلب لاالٰہ الا اللہ ہوگا۔ اور آپ بھی جانتے ہیں کہ ۲۴ سال تک حکمرانوں اور سیاستدانوں نے اسلام کو سیاسی اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لئے ہمیشہ استعمال کیا ہے۔ لیکن یہاں تک اسلام کا نظریہ اور دین و مذہب کا تعلق ہے تو اس سے انحراف کی تمام کوششیں جاری ہیں۔ اس آئین میں ملک کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان رکھا گیا ہے۔ مگر بنظر عمیق دیکھنے پر بھی اسلام کی کوئی بات نظر نہیں آتی۔ ۱۹۵۶ء، ۱۹۶۲ء کے آئینوں میں بھی اس کا نام یہی رکھا گیا تھا مگر دوربین لگاکر بھی اس نظام میں اسلام کی کوئی بات دیکھ نہیں سکتے۔ جمہوریہ اس کو کہا گیا۔ مگر جمہوریت کی کوئی بات اس میں بھی

نہیں مل سکتی۔ اور اب بھی ملک مارشل لاء کے تسلط میں چل رہا ہے۔

مذہب سرکاری۔ اسلام

میرے محترم صدر! بالکل معمولی سی بات ہے کہ محترم وزیر قانون سے (جن کا میرے دل میں احترام ہے) ہم نے مطالبہ کیا کہ آپ یہ دفعہ بھی آئین میں رکھ دیں کہ اس ملک کا سرکاری مذہب اسلام ہوگا۔ اسلامی ممالک مصر، لیبیا کے دساتیر (جن کو بعض لوگوں نے سوشلسٹ قرار دیا) میں بھی یہ دفعہ موجود ہے کہ دین الدولۃ ھو الاسلام۔ تو وہ ملک جو اسلام کے نام سے قائم نہیں ہوئے وہاں بھی ایسی دفعہ موجود ہے —— تو یہاں اگر اس دفعہ کو شامل کر دیا جاتا تو پاکستان کے کروڑوں مسلمان مطمئن ہو جاتے مگر اس معمولی سی بات سے بھی گریز کیا جا رہا ہے۔

بنیادی حقوق کے نام پر ارتداد کی چھٹی ——

—— یہ بھی کہا گیا ہے کہ قرآن و سنت کے خلاف کوئی قانون نہیں بن سکے گا۔ یہ بات بھی میں سمجھتا ہوں کہ ایک دھوکہ ہے اس لئے کہ بنیادی حقوق کی دفعات اس کی نفی کرتی ہیں۔ مثلاً ان دفعات میں مذہبی آزادی کے عنوان میں وضاحت سے کہا گیا ہے کہ پاکستان کے ہر شہری کو یہ حق حاصل ہے۔ کہ جو مذہب اور عقیدہ چاہے قبول کر سکتا ہے۔ اس میں گویا مسلمان کو عیسائی، یہودی، ہندو اور مرزائی بننے کا حق دیا گیا ہے۔ مرتد ہونے کی اجازت دی گئی ہے۔ مگر اسلامی قانون سازی کہتی ہے کہ من بدل دینہٗ فاقتلوہٗ اسلامی قانون کے تحت اگر اس ہاؤس میں ہم قانون سازی کا کام شروع کریں، تو ایسے شخص کو قتل مرتد کی سزا تجویز کریں گے۔ اس لئے کہ اللہ کا ارشاد ہے: انما جزاء الذین یحاربون اللّٰہ ورسولہ ویسعون فی الارض فسادا أن یقتلوا او یصلبوا او تقطع ایدیھم وارجلھم من خلاف۔ الآیۃ

اس طرح حدیث میں ہے: من بدل دینہٗ فاقتلوہٗ۔ جس نے اپنا دین بدل دیا اسے قتل کر دو۔

قرآن و سنت کی ان تصریحات کے باوجود ہم اب یہ سزا تجویز نہیں کر سکتے اس لئے کہ آپ نے آزادیٔ مذہب کے نام سے اُسے اس آئین میں حق دیدیا ہے۔ مگر مسلمان کے لئے سب سے عظیم جرم ارتداد ہے، زنا، شراب خوری، سود خوری، ڈاکہ زنی کا جرم اس سے کم ہے، اگر کم سے کم جرم پر سزا نہیں ہو سکتی تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ آئین کسی طرح اسلامی نہیں کہلا سکتا۔ (اس مرحلہ پر ایوان کے حزب اختلاف کے ساتھ گیلریوں میں بھی زوردار تالیاں بجائی گئیں۔ ایک پوائنٹ آف، آرڈر اٹھائے جانے پر سپیکر نے غیر ممبر حضرات کو کسی قسم کے تاثرات ظاہر کرنے سے روک دیا۔)

عائلی قوانین کی شکل میں مسلمانوں کی مذہبی آزادی کو سلب کیا گیا ہے

جناب صدر! مذہب کی آزادی کی اس دفعہ پر جہاں ہم معترض ہیں۔ وہاں ہمیں ایک گونہ خوشی محسوس ہو رہی تھی کہ اس دفعہ کے

تحت ہم مذہبی امور (اور پرسنل لاء) پر آزادی سے عمل کر سکیں گے۔ اور غیر مسلم اقلیتوں کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی اجازت ہوگی اور یہ ان کا حق ہے۔

سپیکر :- مفتی صاحب میرا خیال ہے، ان امور پر آپ مستقل آئین کے تدوین کے مرحلہ پر مفصل گفتگو کر سکیں گے۔

مفتی صاحب :- جناب والا میں تھوڑی بات کروں گا۔ ع شاید کہ اتر جائے ترے دل میں میری بات

ہمیں یعنی پاکستان کے کروڑوں مسلمانوں کی مذہبی آزادی کو اس دفعہ کے باوجود بنیادی حق (آزادی مذہب کو یکدم سلب کر لیا گیا ہے ـــــ نکاح وراثت یعنی پرسنل لاء کے مسائل جسے ایوب خان نے آرڈیننس کے ذریعہ اس ملک میں نافذ کیا گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم خواتین کے بھی خواہشمند ہیں۔ لیکن میں خواتین کی سلامیت کو بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ تین طلاقوں کے بعد بھی شوہر کو رجوع کا حق نہیں دے سکتا اس طرح کی سلامیتیں عورتوں پر ان قوانین میں کی گئی ہیں۔ مگر آج اس آئین میں فیملی لاء کو بھی تحفظ دیا جا رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ طلاق، وراثت نکاح جیسے احکام میں مسلمانوں کو مذہبی آزادی نہیں دی جا رہی۔ مگر دوسری طرف ارتداد کی اجازت مذہبی آزادی کے نام پر دیا جا رہا ہے۔ اگر ایسا ہے تو ہمیں مذہب کے اصولوں پر عمل کرنے کی اجازت کیوں نہیں ہے۔ میں آپ پر واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ کہ ہمارے ملک (یعنی سرحد وغیرہ میں) آپ اس پر عمل نہیں کرا سکتے نہ اس پر عمل ہو رہا ہے، مذہبی عقیدہ سے مقدم ہوتے ہیں، قانون بعد میں آتے ہیں۔

جائز و ناجائز پیشوں کی آزادی جناب صدر! آئین میں پیشے کی آزادی کو بنیادی حق سمجھا گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس میں کتاب و سنت کے مطابق جائز کی شرط لگانی چاہئے۔ یہاں شراب فروشی، جواء، زنا، قحبہ کاری جیسے پیشے جاری ہیں۔ اس پر پابندی ضروری ہے۔

جناب صدر! موجودہ آئین میں بنیادی حقوق کی حق تلفی کی صورت میں ہائی کورٹ وغیرہ کے علاوہ سپریم کورٹ جانے کی اجازت بھی ضروری ہے۔

حفیظ پیرزادہ صاحب وزیر قانون :- سپریم کورٹ جانے کی اجازت بھی موجود ہے۔

نظر بندی کی دفعہ مفتی صاحب :- دوسری بات نظر بندی کی دفعہ سے متعلق ہے۔ اسلام میں جرم ثابت کئے بغیر مجرم ایک دن بھی جیلوں میں نہیں رکھا جا سکتا۔ قیوم خان صاحب تو تردید کرتے ہیں، مگر میرے سامنے ایسے قیدی مدتوں جیلوں میں رہے۔ سر کاٹے گئے ایسے مولوی ہیں جن کی داڑھی نوچی گئی تھی۔ اس کا کیا مطلب کہ ایک شخص ایک سال جیل میں رہے۔ ایک سال بعد ایک سال

پھر اشد۔

منکرات کی حوصلہ شکنی یا حوصلہ افزائی | پالیسی کے رہنما اصول میں اسلام کا ذکر بار بار آیا ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ منکرات کی حوصلہ شکنی کی جائے گی، مگر میں سمجھتا ہوں کہ جب تک قرآن کے صریح احکام کے مطابق شراب پر پابندی نہیں۔ سفارت خانوں اور تقریبات میں شراب عام ہو، مخلوط تعلیم کا دور دورہ ہو، تو کیا یہ حوصلہ شکنی ہے، نہیں یہ حوصلہ افزائی ہے۔ تو اصول میں یہ بات محض بات ہے۔

عورت کو مخصوص حیثیت دینا عورتوں کی مردوں کے ساتھ برابری نہیں، فوقیت دینا ہے۔ حالانکہ اسلام نے مرد کو فوقیت دی ہے۔ وللرجال علیھن درجۃ۔ (یہاں بعض خواتین ارکان نے بولنا چاہا) مفتی صاحب نے مذاقاً کہا کہ کیا یہ فوقیت نہیں کہ ریل گاڑی میں عورتوں کے الگ کمرے مخصوص ہیں۔ مگر خواتین مردوں کے کمروں میں بیٹھ سکتی ہیں۔ مگر مرد خواتین کے کمرے میں داخل نہیں ہو سکتا۔

سپیکر :- مفتی صاحب تقریر ختم کرنے کی کوشش کریں۔

مفتی صاحب :- بہت جلد ختم کروں گا، بہت جلدی۔

جناب صدر! آئینی تحفظات میں مارشل لاء کے زمانے کی اصلاحات زرعی تعلیمی پالیسی وغیرہ کو تحفظ دیا گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہ اصلاحات کافی نہیں۔ اس سے بڑھ کر اور بھی آگے جانا چاہئے مگر اسلامی اصولوں کی روشنی میں۔ لیکن اسے تحفظ دئے جانے کی صورت میں ہم آگے بڑھ نہیں سکیں گے ......

جبری ریٹائرمنٹ | صاحب صدر! میں سمجھتا ہوں کہ صرف ریٹائرمنٹ کافی نہیں کہ باقاعدہ پنشن بھی جاری ہے اور اسے مجرم ہی سمجھا جائے۔ اگر کورٹ میں الزام ثابت ہوا تو اس کی ساری جائداد ضبط کی جائے۔ لیکن جس صورت میں اسے برطرف کیا گیا ہے یہ عدل و انصاف کے منافی ہے۔ اور جس انداز میں اپیل کا حق دیا گیا ہے، یہ تو رحم کی درخواست ہے۔ جبکہ اسے اپنے اوپر لگائے گئے الزامات کا بھی علم نہیں بہت سے ایسے لوگوں پر ظلم کیا گیا ہے جو ملک کے سچے خادم تھے۔ معلوم نہیں، کونسا ایسا ترازو تھا جس میں وفات پائے ہوئے پہلے سے اور ریٹائرشدہ افراد بھی آگئے۔ تو اس طرح کسی شخص کے حق کو چھین لینا میں سمجھتا ہوں۔ درست نہیں اس کے لئے آپ سپریم کورٹ کے ججوں کو مقرر کریں۔ اب میں صوبائی مختاری کے مسئلے پر بھی کچھ عرض کروں گا۔ (اسی مرحلہ پر صدر ایوان نے حضرت مفتی صاحب کی تقریر ختم کرا دی اور بات ادھوری رہ گئی۔

★

حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی

۱۵ اپریل کو اجلاس کی تیسری نشست میں رات سوا سات بجے حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی نے اپنے مختصر خطاب میں فرمایا :

صاحب صدر! افسوس کہ جس ذات کے ہاتھ میں ذلت، عزت، نصرت ہے۔ اس کی حاکمیت اور اس کے اوامر ونواہی کو پورا تحفظ اور برتری آئین میں نہیں دی گئی۔ پاکستان کو پچھلی شرمناک شکست میں دشمن نے شکست نہیں دی۔ بنگالیوں کے یعنی اپنے بھائیوں کے ہاتھوں شکست ہوئی۔ فوجی حالات کچھ نامساعد رہے مگر میں اسے شکست تسلیم نہیں کرتا مگر پاکستان کو ذلت ہوئی۔ اتنی ابتلاء پر سبق لینا چاہیے تھا۔ (مگر افسوس کہ کوئی نصیحت نہ ہوئی)

کسی ملک کو اسلامی جمہوریہ یا کسی آئین کو اسلامی آئین کہنے سے وہ اسلامی نہیں ہو سکتا۔ جب تک اس کے اندر اسلامی اوامر ونواہی اخلاقی تربیت اور اخلاقی تعلیمات کا پورا لحاظ نہ رکھا جائے۔ تعلیم کی اہمیت بجا ہے۔ مگر دینی تعلیم پھر اس کے ساتھ اخلاقی تربیت نہ ہو تو کراچی کی اکس بے جیسی باتوں کا وقوع پذیر ہونا بعید نہ ہوگا۔

اصلاحات کو شرعی استصواب کے بعد تحفظ دیا جائے

میں قانون کے ان حصوں سے بحث نہیں کرتا جن کا تعلق زرتقین یا حکومت کی ولایت عامہ سے ہے۔ البتہ قرآنی آئین اور شریعت کی اہمیت بہرحال ضروری ہے۔ ہماری حکومت نے اپنی بعض اصلاحات کو آئین میں تحفظ دینا چاہا ہے۔ مجھے اسکی اہمیت کا احساس ہے۔ البتہ اس کو شریعت کے اگر مطابق پائے جائیں تو شرعی تحفظ دینے کیلئے مستند علماء کی کمیٹی کے ذریعہ تحفظ دینا مفید ہے۔ اس آئین میں عائلی قوانین بھی شامل ہیں جس پر مولانا مفتی محمود صاحب نے پچھلی قومی اسمبلی میں دلائل کے ساتھ تنقید کی اور اسے خلاف قرآن وسنت ثابت کیا۔ مگر حیرانگی ہے کہ ایسے قوانین کو بھی تحفظ دیا جارہا ہے۔

جناب صدر! وزیر قانون نے گورنر اور وزیروں کو آرڈیننس جاری کرنے کا حق دیا ہے۔ میں عرض کروں گا کہ وہ آرڈیننس جو صدر یا گورنر جاری کرے اسے اسمبلی میں منظوری کے لئے پیش کیا جائے کہ وہ اسے رد کرے یا منظور یا ترمیم کر سکے۔ تو یہ خامی دور ہونی چاہئے۔

(وزیر قانون نے کہا کہ پچھلے قانون میں یہ کمی تھی اب پوری کر دی گئی ہے۔ مولانا نے کہا بڑی مہربانی۔)

مسلم کی تعریف میں تضاد مغالطہ انگیزی ہے۔ | صدر محترم مسلمان کی تعریف میں تضاد کی آڑ لینا اور دو چار افراد کے کہنے سے حقیقت نہیں بدلی جا سکتی۔ اگر صدر مملکت کے مسلمان ہونے کی تشریح آئین میں نہ کی گئی تو چور دروازوں سے کیمونسٹ یا مرزائی بھی منصب صدارت پر قابض ہو سکے گا۔ اور ہم یہ چیز ہرگز برداشت نہیں کریں گے۔ جب تشریح ہو تو جو بھی صدارت کے لئے کھڑا ہوگا، تو ہر کوئی اس کے مذہب و مسلک کو پوچھ سکے گا۔ (مولانا نے آگے چل کر واضح کیا کہ مسلمان کی تعریف مختلف نشانیاں بتلا بتلا کر خود حضور اقدسؐ اور عہد صحابہؓ میں بھی کی جاتی رہی۔) فرمایا: مثلاً کسی نے لاالٰہ الا اللہ کہا اُسے مسلم کہا جائے گا۔ اور حدیث میں ہے کہ دخل الجنۃ (جنت میں داخل ہوگا۔) مگر اس کا مفہوم یہ نہیں کہ محمد الرسول اللہ کہے تب ہی داخل ہو سکے گا۔ ایک حدیث میں ارشاد ہے۔ من صلی صلاتنا واستقبل قبلتنا واکل ذبیحتنا فذلک المسلم۔ مگر اس کا مطلب بھی صرف نشانیاں بتلانا ہے۔ اس طرح ارشاد ہے المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ (مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ کے ضرر سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔) مگر یہ صرف نشانیاں ہیں، صرف ان کی وجہ سے کوئی مسلم نہیں کہلا سکتا۔ (کہ دیگر عقائد درست نہ ہوں اور صرف ان باتوں سے مسلم بن جائے)

> ہم کسی کیمونسٹ یا مرزائی کا منصب صدارت پر قائم ہونا ہرگز برداشت نہیں کر سکیں گے۔ آئین میں اسلام کو پوری برتری نہیں دی گئی ——
>
> مولانا غلام غوث ہزاروی

اس کے علاوہ اسلامی ممالک کے آئین میں یہ شامل ہے کہ سرکاری مذہب اسلام ہوگا، یہ دفعہ آئین میں ضروری ہے اور مسلمان کا مفہوم اور تعریف بھی واضح کرنا چاہیے۔

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجاہدین کو کسی شہر پر اس وقت حملہ کرنے سے روکا جب تک کہ وہاں اذان کا انتظار نہ کیا جاوے۔ اگر اذان سنائی دی تو حملہ نہیں کریں گے۔ اب اذان سنت ہے، فرض بھی نہیں، مگر سرور عالمؐ نے مختلف نشانیوں کیطرح یہ بھی ایک نشانی بتلائی۔ اسلام نام ہے قرآن و سنت یا خدا اور رسول کی تمام باتوں کو دل سے سچا ماننا اس کو تصدیق کہتے ہیں۔ اگر ایسا نہ کرے تو وہ تکذیب ہے، کفر ہے تو کفر و اسلام کے درمیان (خط فاصل ضروری ہے) اللہ کا ارشاد ہے: ولا تقولوا لمن القیٰ الیکم السلام لست مؤمنا۔ نماز پڑھنے والے کو کافر نہیں کہیں گے، لیکن اگر پتہ لگ جائے کہ وہ فرشتوں کو، تقدیر کو نہیں مانتا یا حضورؐ کو آخری

بنی ہو جاتے تو وہ کافر ہے۔

مولانا عبدالحکیم صاحب

جناب صدر! ہم سے حلف وفاداری اٹھوایا گیا ہے، اس کی روشنی میں موجودہ عارضی آئین کو پاکستان کی سالمیت و استحکام کے لئے ناکافی سمجھتا ہوں۔ دنیا میں مسلمہ اصول ہے کہ جس نظریہ سے جغرافیائی اعتبار سے مملکت وجود میں آتی ہے آنے والی حکومت اسکو قائم رکھنے کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے موجودہ آئین میں ایک تو مسلمان کی تعریف ضروری ہے۔ اور یہ پاکستان کے استحکام کے لئے ضروری ہے۔ اس پر ملک کے اتحاد اور مسلم ممالک سے رابطہ کا دارومدار ہے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو مسلم اکثریت اقلیت میں تبدیل ہو جائے گی۔

چیئرمین صاحب (چوہدری فضل الہی صاحب) مفتی صاحب نے اس معاملہ پر کافی وضاحت کی ہے۔ مولانا صاحب ہے۔ اگر کسی ملک کے سربراہ کا مذہب اسلام نہ ہوگا تو پالیسی کو نظر انداز کریگا دوسری بات یہ ہے کہ اخلاق کو تباہ کرنے والے پیشوں پر تو پابندی نہیں لگائی گئی۔ مگر اس ملک کے بعض علاقوں میں بھیڑ بکریوں کی تجارت جیسا جائز پیشہ ممنوع ہے۔ (آگے اس پر تفصیل گفتگو کی۔) عائلی قوانین کو تحفظ دینے پر تنقید کرتے ہوئے آپ نے کہا کہ ان قوانین سے ملک کی جیسیوں مائیں بہنیں اور بیٹیاں اعیاش مزاج لوگوں کا کھلونا بن سکتی ہیں۔ ایک شرابی شوہر شراب پی کر بیوی کے پاس جاکر اسے طلاق دیتا ہے۔ مگر یہ قوانین اس کی طلاق معدوم کر دیتے ہیں بار بار کی سے ربوتا کرواتے ہیں۔ دس سال کی آمریت نے ان قوانین کو مخصوص اغراض کیلئے رکھا ہم اسکو برداشت نہیں کر سکتے اور ہمارے سرحد اور بلوچستان میں اس پر عمل نہیں ہوگا۔ اور نہ جبراً عمل کرایا جا سکے گا۔ اسلام نے سارے ادیان و مذاہب سے زیادہ حقوق خواتین کو دیئے۔ انہیں فاطمہؓ اور خدیجہؓ کا مقام دیا۔ اسے ماں، بیوی، بیٹی، بہن کا مقام دیا [illegible] ہماری خواتین کو مستشرقین یورپ نے مغالطہ دیا۔ یورپی تہذیب نے عورتوں کے ساتھ

> موجودہ آئین میں عائلی قوانین کا نہیں
> عورتوں کی
> عزت و آبرو کا
> تحفظ
> ہونا چاہئے
> (مولانا عبدالحکیم صاحب)

ظلم ہوا ہے سٹوری کی اس کے وقار کو گھٹایا ہم چاہتے ہیں کہ اس آئین میں عورتوں کی عزت و آبرو کا تحفظ ہونا چاہئیے نہ کہ عائلی قوانین کا۔ وزیر قانون صاحب اس ترمیمی بل کو واپس کر دیں۔

زرعی اصلاحات کو جو تحفظ دیا گیا ہے اس کا کم از کم مروے تو کیا جانا چاہئیے کہ کیا فائدہ پہنچا۔ مالک اور مزارع کی خانہ جنگی شروع ہو گئی ہے۔ مگر اس کے انسداد کے لئے کوئی کارروائی نہیں کی جاتی ایسی اصلاحات سے ملک کا نظم ونسق اور اتحاد بگڑ گیا ہے۔ اس لئے زرعی اصلاحات کو تحفظ نہ دیا جائے۔

■■

بقیہ: احوال وکوائف | ۱۷ اپریل کو واپسی ہوئی ۔۔۔ ۲۵ اپریل کو اسلامیہ کالج پشاور کی دعوت پر آپ نے وہاں کے جلسۂ سیرت میں شرکت کی۔ دس بجے آپ کالج کے روز کیپل ہال پہنچے تو جناب عبدالہاشم خان صاحب وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی نے پرنسپل صاحب اسلامیہ کالج اور دیگر حضرات کے ساتھ استقبال کیا۔ ہال یونیورسٹی کے طلبہ سے کچھا کھچ بھرا ہوا تھا۔ حضرت مدظلہ اس تقریب کے مہمان خصوصی تھے اجتماع کی صدارت بھی آپ نے فرمائی ۔۔۔ وائس چانسلر صاحب اور پرنسپل صاحب نے آپ کا پرجوش اور پرخلوص کلمات سے خیر مقدم کیا حضرت مدظلہ نے ایک گھنٹہ تک حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے مختلف گوشوں پر سیر حاصل روشنی ڈالی تمام شرکا و سامعین طلبہ نے نہایت وقار اور سنجیدگی سے آخر تک حضرت کے ارشادات سنے۔ آخر میں آپ نے یونیورسٹی کے حکام عملہ و اساتذہ کے ساتھ چائے اور دوپہر کی دعوت طعام میں شرکت کی۔

یکم مئی کو پشاور کے گورنر ہاؤس میں حضرت مفتی محمود صاحب کے حلف وفاداری اٹھانے کی تقریب ہوئی اس میں حضرت شیخ الحدیث صاحب نے بھی شمولیت فرمائی۔ طلبۂ دارالعلوم حقانیہ نے منصب وزارت پر فائز ہونے اور شراب پر ان کے اعلان پابندی کی خوشی میں شہر میں ایک شاندار جلوس نکالا۔ ۶ مئی کو آپ پشاور میں جمعیۃ کے تاریخی کنونشن میں شریک ہوئے۔

۔۔۔ ماہ رواں میں دارالعلوم کے طلبہ سے مولانا قاضی عبداللطیف جہلم اور مولانا عبدالشکور دین پوری نے خطاب فرمایا۔

■■

سیرتِ نبیؐ اور مستشرقین

حضرت علامہ مولانا شمس الحق افغانی
شیخ التفسیر جامعہ اسلامیہ بہاولپور

کسی عظیم شخصیت کے متعلق تین امور ایک منصف مزاج محقق کی نگاہ میں قابل توجہ ہیں

۱۔ تاریخی تعارف

۲۔ ذاتی کردار

۳۔ اس کے دائرۂ کار سے متعلق کارنامے۔

۱۔ تاریخی تعارف: اقوام عالم میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے قبل جس قدر پیشوایانِ دین اور بانیانِ ملت اور انبیاء علیہم السلام گزرے ہیں۔ ان کے تاریخی تعارف کے متعلق ان کی وفات سے لے کر اب تک یقینی طور پر اس سے زیادہ کچھ بھی معلوم نہیں جو بائبل میں ان کے متعلق مختصر تذکرہ درج ہے۔ اور وہ عدم محفوظیت اور تحریفات کی وجہ سے ان کی عظمت شان کے خلاف ہے۔ مثلاً حضرت نوح علیہ السلام کے متعلق کتاب پیدائش باب ۹ آیت ۲۱ میں ہے۔ "نوح نے شراب پی اور ننگا ہو گیا۔" اور حضرت لوط علیہ السلام کے متعلق کتاب پیدائش باب ۱۹ آیت ۳۰ تا اختتام باب میں مذکور ہے "لوط نے شراب پی اور اپنی صاحبزادیوں سے ہمبستر ہوا وہ حاملہ ہوئیں اور ان سے اولاد پیدا ہوئی۔" انجیل متی باب ۲۶ میں ہے کہ "یہودا حواری نے تیس روپے رشوت لے کر مسیح کو گرفتار کرایا۔"

بائبل کے ان حوالجات سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ اس میں جو تھوڑا بہت تذکرہ موجود ہے وہ بھی پر از اغلاط اور ناقابل اعتبار ہے۔ جو یہود اور نصاریٰ کے مذہب کی بنیادی کتاب ہے۔ باقی ان حضرات کے متعلق ان کے قریب زمانے میں کوئی مستند سوانح یا حالات سند کے ساتھ تحریر نہیں کی گئی اس کے برخلاف حضور علیہ السلام کی ذات وہ واحد شخصیت ہے جو تاریخی تعارف کے اعتبار

سے یکتا ہے۔ ان کی پیدائش، بچپن کے حالات اور زندگی کے کل واقعات مستند کے ساتھ موجود ہیں۔ ان کی تعلیمات اور ملفوظات کا ایک ایک حرف مستند طریقے پر کتب حدیث و سیر میں موجود (درست) ہے۔ اور آج بھی اگر کوئی شخص آپ کی زندگی کا کوئی واقعہ معلوم کرنا چاہے تو معلوم کر سکتا ہے۔ گویا حضور علیہ السلام آسمانِ تاریخ کے ایک آفتاب جہانتاب ہیں جس میں آپ کی ذات کا ہر خدوخال نمایاں ہے۔ آپ کی زندگی کے حالات میں مختلف زبانوں میں مسلم و غیر مسلم مصنفین نے جس قدر کتابیں لکھی ہیں، آج تک کسی شخصیت کے متعلق اتنی کتابیں نہیں لکھی گئیں۔

احادیث: آپ کے ملفوظات دینی یعنی احادیث دس لاکھ سے زائد تحریر میں آچکی ہیں۔ اور ان کے حفاظ بھی موجود تھے، جن کو یہ ملفوظات زبانی یاد تھے۔ امام احمد حنبل دس لاکھ احادیث اور امام ابوزرعہ سات لاکھ احادیث کے حافظ تھے۔ قسطلانی نے فلاس سے نقل کیا ہے کہ جو حدیث امام بخاریؒ کو معلوم نہ ہو وہ حدیث نہیں۔ یعنی آنحضور علیہ السلام کی تمام احادیث اور ملفوظات دینی یاد تھے۔

جن اہل ایمان نے حضور اکرمؐ کی صحبت پائی ہے (یعنی آپ کے دوست اور صحابہؓ تھے۔ ان بارہ صحابہؓ سے تقریباً بارہ ہزار کے احوال تاریخ میں قلمبند ہیں۔

کیا ایسی شخصیت دنیا اور خاص کر ایسے ملک میں جو امیین اور ناخواندوں کا ملک ہو، کوئی بتا سکتا ہے کہ ان کی احادیث یعنی باتیں کروڑوں انسانوں کیلئے قانونِ زندگی کی حیثیت رکھتی ہوں اور دس لاکھ کی تعداد میں قلمبند ہوں اور صدیوں تک یہی تعداد مختلف محدثین کے سینوں میں محفوظ ہو۔ اور بارہ ہزار دوستوں کے احوال بھی صحیح سند کے ساتھ اور مستند طریقے سے ضبط تحریر میں آچکے ہوں، اس سے بڑھ کر تاریخی حفاظت کسی دوسرے انسان کو تاریخی دور کے کسی حصے میں حاصل نہیں ہوا ہے۔

۲۔ ذاتی کردار: حضور علیہ السلام کامل ہونگے امتِ محمدیہ بلکہ کل اقوامِ بشریہ کیلئے اسوہ حسنہ اور نمونۂ انسانیت کامل تھا۔ اس لئے دستِ قدرت نے سنتِ نبوی کی شکل میں اور امتِ محمدیہ صالحہ کے اعمال کی صورت میں اسکو محفوظ رکھا۔ تاکہ قیامت تک اگر انسان کامل بن جانے کی کوشش کرنیکا خواہاں ہو تو اس نمونہ کو سنتِ نبویہ سے حاصل کر سکتا ہے۔ اسوۂ نبوی یا محمدی اس قدر ایک بحر ناپیدا کنار ہے کہ اسکا احاطہ ناممکن ہے۔ لیکن ہم صرف ان میں سے چند امور (جن کو دوست دشمن سب تسلیم کرتے ہیں) بیان کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں۔

انسان بہیمیت اور ملکیت کا مجموعہ ہے۔ بہیمیت تین صفات کو پیدا کرتی ہے۔ ۱۔ حرص النفس، یعنی اشتہات ۔ ۲۔ قہر و غضب ۔ ۳۔ تکبر و پندار یہ تینوں اگر ملکیت کے تابع ہو جاتے ہیں تو تین کمالات

بالترتیب پیدا ہو جاتے ہیں، جوشِ نفس تابع ملکیہ ہو کر عفت، پاکدامنی وقناعت اور پرہیزگاری میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ قہر وغضب شجاعت میں بدل جاتے ہیں۔ تکبر و پندار تواضع کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اور انسانیت کمال کو پہنچ جاتی ہے۔

ملکیہ کے تابع ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ یہ تینوں بہیمی طاقتیں رضاء الہٰی کے ماتحت آجاتی ہیں۔ خواہش نفس محل رضاء الہٰی میں استعمال ہوتی ہے۔ مثلاً نکاح۔ اور جہاں اللہ کی رضا نہ ہو۔ بلکہ غضب ہو وہاں استعمال نہیں ہوتی، مثلاً زنا وغیرہ۔ اسی طرح خواہش حلال کمانے اور کھانے میں استعمال ہوتی ہے۔ حرام کمانے اور حرام کھانے مثلاً سود، ظلم، غصب، چوری، رشوت اور دھوکہ وغیرہ میں استعمال نہیں ہوتی۔ قہر وغضب حفاظت خود اختیاری یا حفاظت حقوقِ مظلومین وحفاظت حقوق الہٰیہ میں استعمال ہوتے ہیں۔ اور اس کے خلاف مثلاً انسانوں پر ظلم اور ناحق میں استعمال نہیں ہوتا یہی بہادری وشجاعت کہلاتی ہے باقی درندگی ہے۔

ملکیہ کا اثر تقویٰ خشیۃ اللہ اور خوفِ آخرت ہے۔ جس سے محاسبۂ نفس علم و معرفت وغیرہ پیدا ہوتے ہیں کہ یہ اوصاف انسان ہی کے مخصوص کمالات ہیں۔ ان کمالاتِ چہارگانہ کے تحت ہم سیرتِ نبویہ پر بحث کرتے ہیں۔

عفت وقناعت | ۱۔ عفت وقناعت یہ وہ وصف حضور علیہ السلام کے ایسے ہیں کہ دوست دشمن اقراری ہیں کہ آپ نے بچپن سے جوانی اور جوانی سے ادھیڑ عمر تک یعنی قریباً ۵۵ سال کی زندگی اپنے دشمنوں یعنی کفارِ مکہ اور قریش میں گذاری، جہاں نہ کوئی حکومت موجود تھی نہ قانون، پورا ماحول سیاہ کارانہ تھا۔ اور اسکو عیب بھی نہ سمجھا جاتا تھا۔ زنا، شراب اور سود خواری عام تھی۔ انہیں لوگوں میں رہ کر آپکو خلعت نبوۃ سے نوازا گیا۔ اور پوری سوسائٹی جانی دشمن بن گئی۔ اور آپ کے قتل کے درپے ہو گئے۔ لیکن ان دشمنوں کی زبان سے بھی ایک لفظ آپ کی ذات کے متعلق نہ نکل سکا جو آپ کی پاکدامنی، عفت، قناعت اور امانت کے خلاف ہو۔ بلکہ آپکو اپنے جھگڑوں کا حکم مان کر آپ سے فیصلہ کراتے تھے۔ اور امین کے لقب سے مشہور تھے۔ یعنی آپ وہ ذات ہیں کہ آپ سے ہر کسی کی جان، مال اور عزت بالکل امن اور محفوظ ہے۔ بلکہ بعد از ہجرت آپ کے اس وقت کے بدترین دشمن ابو سفیان سے ہرقلیس شاہ روم نے پوچھا کہ: ھل کنتم تتھمونہ بالکذب قبل ان یقول ماقال۔ کیا تم ان پر جھوٹ کا گمان وتہمت کا خیال کرتے رہے ہو۔ دعویٰ نبوت سے پہلے۔ قال لا۔ جواباً ابو سفیان نے کہا کہ نہیں۔ آپ کی گفتار میں کبھی

سچائی کی اس شہرت کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا، اور کفار نے جو قرآن کے دشمن سخت، ہیں کہ اس کا انکار نہیں کیا۔ قرآن نے فرمایا: انھم لا یکذبونک۔ کہ یہ کفار تم پر جھوٹ کا الزام نہیں دھرتے۔
پچیس سال کے جوشِ جوانی کی زندگی آپ نے تجرد اور زہد و تقویٰ میں گذاری۔ پھر حضرت خدیجہؓ کی درخواست پر جو چالیس سال کی بوڑھی تھیں اور جو تین شوہروں سے یکے بعد دیگرے بیوہ ہو چکی تھیں، اور دنیا سے ان کا دل سرد ہو چکا تھا۔ ایک سردار نے ہزار اونٹ کے مہر نکاح کی پیشکش کی، لیکن نکاح سے انکار کر دیا۔ حضرت خدیجہ پاکدامنی کی وجہ سے "طاہرہ" کے نام سے مشہور تھیں، ان کے غلام نے سفرِ شام کے جو احوال انہیں سنائے اور اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل عالمِ توراۃ و انجیل سے جو کچھ آپ کے متعلق سنا، ان سے حضرت خدیجہؓ کو یقین آگیا کہ آخری نبیؐ آپ ہی ہوں گے۔ اس لئے از خود نکاح کی درخواست کی اور پچیس سال سے زائد عرصہ آپ نے اسی ایک بوڑھی بیوی کے نکاح پر قناعت کی۔ اگرچہ جوان عورتوں کی کمی نہ تھی۔ اس کے بعد جس قدر نکاح حضورؐ نے کئے ہیں، حضرت عائشہؓ کے سوا سب بیوگان تھیں جس پر یورپ کے مستشرقین نے اعتراض کیا اور بلا تحقیق جو جی میں آیا لکھ دیا۔

تعدد ازدواج | چنانچہ انہوں نے تعددِ نکاح نبوی کو ہدفِ طعن بنایا، اور اسکو نفسانیت کا رنگ دیا۔ ان کے اس اعتراض کے تین اجزاء ہیں، ۱۔ نفسِ قانونِ تعدد پر اعتراض۔ ۲۔ نیتِ نبوی پر اعتراض کہ اس نکاح کی محرک ہوائے نفس تھی۔ ۳۔ تعداد زوجات، امت کے حق میں چار تک ہے۔ لیکن حضور علیہ السلام نے نو یا گیارہ تک نکاح کئے، اس فرق پر اعتراض۔

قانونِ تعددِ نکاح پر اعتراض | ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا قانون یورپ کے خود ساختہ قانون کا پابند نہیں۔ ہم اس سوال کا جواب دو طرح دیتے ہیں۔ (۱) نقلی یعنی یہود اور نصاریٰ کی مسلم کتاب بائبل سے۔ پہلا حوالہ ابو الانبیاء حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ہے۔ بائبل پیدائش ۱۶/۳ میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تین بیویاں بیک وقت تھیں۔ سارہ، ہاجرہ، قطورا۔

(۲) پیدائش ۲۹/۲۲ میں ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی بیک وقت چار بیویاں تھیں۔ لیا، زلفہ، راخل، بلہہ۔ (۳) حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بھی تعدد زوجات یعنی دو بیویاں تھیں۔ استثناء ۲۱/۱۵-۱۰۔ (۴) حضرت داؤد علیہ السلام کی انیس بیویاں تھیں۔ شموئیل ۲/۳۔ (۵) حضرت سلیمان علیہ السلام کی ایک ہزار عورتیں تھیں۔ سلاطین ۱۱/۳۔ یہ سب بائبل کے مستند پانچ انبیاء علیہم السلام کی متعدد زوجات کے حوالے ہیں۔ اگر ان پر مستشرقین کو اعتراض نہیں ہے تو تعددِ نکاحِ نبوی پر اعتراض کس منہ سے کرتے ہیں۔ یہ تو قانونِ تعددِ نکاح کی نقلی دلیل عیسائیوں کی بائبل سے دی گئی۔ اب عقلی دلیل تعددِ نکاح کی ملاحظہ کرو۔ اور کس لو۔

(باقی آئندہ)

میری علمی اور مطالعاتی زندگی

حضرۃ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

سلسلہ ۳

میری علمی و مطالعاتی زندگی کے زیرِ عنوان پیش نظر مضمون میں عالم اسلام کے فرزندِ جلیل داعیٔ کبیر مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ (صدر ندوۃ العلماء لکھنؤ) نے سوالنامہ کی اس شق کے بارہ میں روشنی ڈالی ہے جس میں شخصیت پر اثر انداز ہونے والی محسن کتابوں کے بارے میں دریافت کیا گیا تھا۔ گویا مولانا کے اس پُر مغز اور معلومات آفریں مضمون میں ان کی عمر بھر کے علمی اور مطالعاتی زندگی کا عطر کشید ہو چکا ہے۔ لیجئے مشامِ جان معطر کیجئے۔ مولانا جیسے کثیر الاشتغال شخصیت پیر ضعف و علالت کے باوجود اتنی توجہ اور کرم فرمائی! یہ سب اس علمی جذب و شوق اور اس دینی درد و سوز کے کرشمے ہیں جسکی شعاعوں اور جس کی حرارت سے صرف عالم اسلام بلکہ دنیا کے بیشمار مسلمان بھی اپنے دلوں میں ایمان و یقین کا نور اور وسعت و عزیمت کی گرمی محسوس کر رہے ہیں —— (سمیع الحق)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ امید ہے کہ آپ اور حضرت مولانا بخیر و عافیت ہوں گے۔ میں اکتوبر کے دو ہفتے ہسپتال رہا۔ رمضان المبارک سے چند دن پیشتر گھر آیا، ہسپتال ہی میں مضمون پر نظرِ ثانی کا کام شروع کر دیا تھا۔ اب اس کو صاف کرا کر۔ آپ کے پاس بھیج رہا ہوں۔ اس میں معتدبہ اضافے ہوئے خدا کرے آپ پسند کریں۔ بہرحال میں اپنے وعدہ سے سبکدوش ہو گیا۔ اس مضمون کی رسید سے ضرور مطلع کریں۔ جی لگا رہے گا۔
حضرت والد صاحب کی خدمت میں بہت بہت سلام اور درخواست دعاء

والسلام
مخلص
ابوالحسن علی - ۱۷ رمضان ۱۳۹۱ھ

۱۳۴۴ھ (۱۹۲۵ء) میں رسالہ "الندوہ" کی طرف سے جس کا مولانا سید سلیمان صاحب ندوی کے حکم و تحریک سے تیسری بار اجراء کیا گیا تھا، اور وہ راقم سطور، اور رفیق محترم

مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی سابق استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء (حال ناظم دینیات جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی) کی ادارت میں شکل رہا تھا، مشاہیر اہل علم و اہل فکر کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ طلبہ اور اہل ذوق کے فائدے و رہنمائی کے لئے ان کتابوں کا تذکرہ فرمائیں جنہوں نے ان کی ذہنی، علمی، دینی، و اخلاقی تشکیل و تعمیر میں خاص حصہ لیا، ہندوستان کے قدیم و جدید مشاہیر و فضلاء نے اس دلچسپ و مفید بحث و مذاکرہ میں حصہ لیا۔ ان کے مقالات "الندوہ" میں شائع ہوتے رہے، بعد میں "مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں" کے نام سے یہ مجموعہ شائع ہوگیا۔

بعض احباب کے اصرار سے راقم سطور نے بھی (جس کی عمر اس وقت ۲۳ سال کی کی تھی، اور اسکی علمی و تصنیفی زندگی کا آغاز ہوا تھا۔) طلبائے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے فائدے اور دلچسپی کے خیال سے اپنے تاثرات و تجربات قلم بند کئے، وہ مضمون اسوقت دارالعلوم کی مجلس علمی میں سنایا گیا، اور ان مضامین کے مجموعہ میں بھی شامل کیا گیا، اب محب گرامی مولانا سمیع الحق صاحب کی خواہش و فرمائش پر اس پر نظر ثانی کی گئی ہے، اور جا بجا اضافے کردئے گئے ہیں، لیکن جن کتابوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، وہ تقریباً وہی ہیں جنہوں نے ۲۵-۲۴ سال کی عمر تک متاثر کیا، کہ یہی زمانہ ذہنی نشوونما اور ارتقاء کا تھا، اس کے بعد جو کتابیں تحقیق و تصنیف اور تدریس کے دوران مطالعہ میں آئیں ان کی تعداد بہت زیادہ اور ان کے متعلق اظہار خیال بہت مشکل ہے۔

مضمون کے مطالعہ کے وقت یہ ملحوظ رہے کہ اس کا طرز واقعاتی اور سوانحی ہے، تنقیدی اور تحقیقی نہیں، اس نے ذہن پر مطالعہ کے جو اثرات پڑے، ان کو بے تکلفی، اور بے ساختگی کے ساتھ بیان کر دیا ہے مصنفین کے خیالات، مسلک اور طرز فکر کی پوری ذمہ داری نہیں لی گئی، اور نہ کسی ایسی کتاب اور مصنف کا ذکر محض اس کے مفید یا بلند پایہ ہونے کی وجہ سے کیا گیا ہے، جس کے مطالعہ کی نوبت نہیں آئی، یا ذہن و شعور نے اس سے کوئی گہرا اور دیرپا تاثر قبول نہیں کیا، اس لئے اس فہرست میں سے کسی کتاب یا مصنف کے نظرانداز ہو جانے کے معنی اس کی عدم افادیت، یا تنقیص نہیں ہے۔

(ابوالحسن علی)

خاکسار کا خاندان ایک خوشحال و سیدھا دینی خانوادہ[1] ہے جس کے بزرگوں نے کبھی ذہنی خوشحالی میں بھی

---

[1] خاندان حضرت سید احمد شہیدؒ، متوطن رائے بریلی (ادارہ)

دیا کہ پیام بہار سنایا تھا، ہندوستان میں جب دلی کی بہار آخر ہوئی تو اس خاندان پر بھی تنزل آیا، بخشش کی آنکھیں کھولیں تو دین والی بولیوں سے زیادہ پڑھنے والوں میں، اور مردوں سے زیادہ عورتوں میں تھی۔

میرے والد مرحوم مولانا حکیم سید عبدالحئی نے ۱۳۴۱ھ/۱۹۲۳ء کے شروع میں انتقال کیا، میری عمر اس وقت دس سال کی تھی، میرے بڑے بھائی صاحب ڈاکٹر حکیم مولوی سید عبدالعلی صاحبؒ لکھنؤ میں میڈیکل کالج میں پڑھتے تھے، اور میں اپنے وطن رائے بریلی میں اپنی والدہ صاحبہ کے ساتھ رہتا تھا، اور بھائی صاحب کی ہدایت کے مطابق خاندان کے بعض بزرگوں سے فارسی کی کتابیں پڑھتا تھا۔ اور لکھنؤ بھائی صاحب کے پاس آتا جاتا رہتا تھا ـــــــ۔

خاندان میں دستور تھا کہ تقریباً روزانہ اور ان دنوں میں خاص طور پر جب کسی حادثہ کی وجہ سے تسکین و تسلی کی ضرورت ہوتی، ایک گھر کی تمام بیبیاں ایک جگہ جمع ہو جاتیں، اور ہمارے ہی خاندان کے ایک بزرگ (سید عبدالرزاق صاحب کلامی م ۱۳۳۴ھ/۱۹۱۶ء) کی منظوم "فتوح الشام"[1] پڑھی جاتی۔

سید عبدالرزاق صاحب کلامی مرحوم حضرت سید احمد شہیدؒ کے ہمشیرزادہ منشی سید حمید الدین صاحبؒ کے پوتے اور ان کے حقیقی بھائی سید عبدالرحمن صاحب کے نواسے تھے، واقدیؒ کی عربی "فتوح الشام" کو کلامی صاحب نے بڑی قادر الکلامی، اور جوش و دلی جذبہ کے ساتھ پچیس ہزار شعروں میں اردو میں نظم کیا ہے، چونکہ ان کو اس کا طبعی ذوق تھا، اور جہاد و حمایت ایمانی کی چنگاری اسی تنور سے مشتعل ہوئی تھی، جس نے ایک وقت میں سارے ہندوستان کو گرما دیا تھا، اس لئے نظم میں بڑا جوش و اثر اور کلام میں آمد ہے۔ حضرت خالدؓ صحابہ کرامؓ سے عشق تھا، اور خواب میں بارہا ان کی زیارتیں ہوئی تھیں، اس لئے خصوصیت کے ساتھ ان کا ذکر کرتے ہوئے وہ بے قابو ہو جاتے ہیں، اور اشعار میں خاص روح اور تڑپ پیدا ہو جاتا ہے۔ میری بڑی خالہ سیدہ صالحہ مرحومہ جو قرآن مجید کی بھی حافظہ تھیں یہ منظوم "فتوح الشام" بڑے پر اثر و دلکش لہجہ میں پڑھتی تھیں، اور پڑھتے پڑھتے کتاب ان کو بہت رواں ہو گئی تھی، عموماً عصر کے بعد یہ مجلس ہوتی، بچے بھی کبھی اپنی ماؤں کے پاس کھیلتے کھیلتے یا کسی پیغام کے لئے آجاتے، اور بے ارادہ کچھ دیر ٹھہر کر سنتے، کبھی بارادہ بیٹھ جاتے، اور کبھی مائیں اپنے پاس بٹھا کر سننے کا موقع دیتیں، پھر جب اس میں لطف آنے لگتا تو کھیل چھوڑ کر اس مجلس میں شریک ہو جاتے۔ میری خالہ مرحومہ جب سادہ و بے تکلف

---

[1] یہ کتاب بڑی تقطیع پر "صمصام الاسلام" کے نام سے مطبع نولکشور، لکھنؤ کی طرف سے شائع ہوئی تھی، بہت سے دیندار خاندانوں میں وہ بڑے ذوق و شوق سے پڑھی جاتی تھی۔

لیکن پر اثر لہجہ میں یہ اشعار پڑھتیں، تو جہاد کا ایک سماں بندھ جاتا، دل امنڈ آتے، حضرت خالدؓ، حضرت ضرارؓ اور ان کی بہن حضرت خولہؓ بنت ازورؓ اور دوسرے صحابہ کرامؓ، مجاہدین شام کی جانبازی اور شجاعت کا ذکر آتا تو مجلس پر ایک کیف و سرور اور نشہ سا طاری ہو جاتا، کسی سخت معرکہ میں مسلمانوں کے گھر جانے اور کسی مجاہد کے شہید ہونے کا تذکرہ ہوتا تو آنسوؤں کی جھڑیاں لگ جاتیں، آنسوؤں کے یہ طوفان اٹھتے اور برستے تو ان کا چھینٹا ہمارے معصوم دلوں پر بھی پڑ جاتا، اور اس نرم مٹی کو تر کر جاتا، "فتوح الشام" کی ان زندہ مجلسوں نے دل پر یہ اثر چھوڑا کہ مجاہدین کی محبت و عظمت اور اللہ کی راہ میں جان دینے کی قیمت کو کوئی نئی علمی تحقیق، اور جہاد کو مدافعانہ ثابت کرنے کی کوئی کوشش کم نہیں کر سکی، ذہن کے نقش کو سیاہی کے وہ نقوش کبھی نہیں مٹا سکے، جو بیٹھے لیٹے یا آرام سے بیٹھے بیٹھے کاغذ پر ثبت کئے جائیں، پھر وہ نقش جس کو بچپن کے پاک آنسوؤں نے سیرابی بخشی ہو —

اتانی هواها قبل ان اعرف الهوی
فصادف قلباً خالیاً فتمکنا

دوسرا اثر یہ ہوا کہ اس قوم و مذہب کے خلاف (عیسائیوں) جن کے مقدر میں قیامت تک کیلئے اسلام کا عالمگیر حریف و مقابل بنا کر دیا گیا ہے، اور جس کی تازہ مثال اور وراثت موجودہ یورپ کے حصہ میں آئی ہے۔ ایک حریفانہ جذبہ اور عناد پیدا ہو گیا، جس پر کسی ملک کے مقامی مسائل و حالات کبھی غالب نہیں آسکے۔

اس وقت شرفاء کے خاندانوں میں "مسدس حالی" کا عام رواج تھا، اس کے اشعار لوگوں کے نوک زبان تھے، تقریروں اور مواعظ میں جا بجا اس کے اشعار سے کام لیا جاتا، مضامین میں نقل کئے جاتے۔ میں نے بھی "مسدس" کو بڑے جوش و لطف سے بار بار پڑھا اس کے اشعار اپنی تقریروں میں جو بچوں کے جلسوں میں کی جاتیں، اور ان ابتدائی مضامین میں جو مقابلہ کے لئے لکھے جاتے، بار بار نقل کئے۔ اس کا بہت سا حصہ زبانی یاد تھا۔ دل و دماغ پر "مسدس" کا اچھا خاصہ اثر رہ چکا ہے، عام استعداد و معلومات میں اضافہ کے علاوہ اس کا ایک احسان یہ تھا کہ برسوں بعد مغربی مؤرخین و مصنفین کی یہ کوشش باطل بے اثر رہی، کہ جاہلیت عرب کی اتنی مدح سرائی کی جائے اور اس میں اگر خوبی کے کچھ ذرات تھے تو ان کو خوردبین سے دیکھ کر پہاڑ بنا کر اس طرح پیش کیا جائے کہ معلوم ہو کہ عربوں میں اخلاقی انقلاب کی پوری تیاری تھی، اور کوہ آتش فشاں پھٹنے کو تھا کہ مورخ شناسی سے بروقت اسکو چنگاری دکھا دی گئی، اسلامی انقلاب کی پیغمبرانہ عظمت، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزہ کی اہمیت کو گھٹانے کی یہ علمی سازش مولانا حالی کے ان پر اثر اور سادے چند بند پر غالب نہ آسکی، جن میں انہوں نے جاہلیت کا نقشہ اور اسکی اخلاقی پستی کی تصویر کھینچی ہے۔ نہ بعض قوم پرست عربوں کے

مضامین اور تالیفات متاثر کر سکیں جو اپنی قومیت
کے جوش میں کبھی کبھی جاہلیت کی طرف سے مدافعت
کرنے لگتے ہیں۔ اور اس کے روشن پہلو کے دکھانے
میں مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔

میرے گھر کا ماحول دادا صاحب (مولوی
سید فخرالدین صاحب خیالی) اور والد صاحب
کی وجہ سے جو جید عالم اور عربی کے مصنف ہونے
کے ساتھ ساتھ اردو کے ادیب و نقاد بھی تھے
دینی کے ساتھ ادبی بھی تھا، بہت بچپن ہی سے
اردو نثر و نظم کی مدرسی اور غیر مدرسی کتابیں ہم بھائی
بہنوں کے مطالعہ میں رہتی تھیں، مولانا حالی، ڈپٹی
نذیر احمد، راشد الخیری کی بہت سی کتابیں اس
زمانہ میں پڑھ لیں، اس زمانہ میں عام طور پر مولوی
اسماعیل صاحب میرٹھی کا اردو نصاب "کلک اردو"
"سواد اردو" اور "سفینۂ اردو" رائج تھا۔
ہندوستان کا سررشتۂ تعلیم ان کتابوں سے بہتر
کتابیں مرتب نہیں کروا سکا، ان میں "سفینۂ اردو"
کا اثر آج تک دل و دماغ پر باقی ہے، تقریباً
نصف صدی گذر جانے کے بعد اور ذہنی بلوغ
وارتقار کے بہت سے منازل طے کر لینے
کے باوجود اب بھی اگر وہ کتاب ہاتھ آ جائے
(جو افسوس ہے کہ اب بالکل نایاب ہے) تو
شاید سب کام چھوڑ کر اسی کو پڑھنے لگوں، اور
بچپن کی یاد تازہ کروں، اور کم سے کم اپنی چند پسندیدہ
نظمیں اور مضامین مولوی ظفر علی خاں بی۔اے علیگ
کی نظم "رابعہ و سیرت کی کہانی" اور حیدر آباد کے
طوفان پر ان کی نظم "او نامراد ندی" سید سجاد
حیدر یلدرم کا مضمون "مجھ کو میرے دوستوں سے بچاؤ"
کو ایک بار پڑھے بغیر ہاتھ سے رکھنا مشکل ہو جاتے،
اس غیر شعوری مطالعہ کا یہ فائدہ ہوا کہ زبان کا لطف
اور ذوق زندگی کے ہر دور میں ساتھ رہا، اور تحریر و
انشاء میں کبھی زیادہ مشکل پیدا نہ ہونے پائی، میرے
خیال میں ابتدائے عمر میں سلیس و شگفتہ زبان اور
اچھے مصنفین کی کتابوں کا پڑھنا جو سلیس و شیریں
زبان میں اپنے خیالات ادا کرنے کے عادی ہیں
بہت مفید اور ایک حد تک ضروری ہے، ورنہ
نئی نسل، اور گذشتہ عہد سے رشتہ منقطع ہو جاتا ہے۔
اور دعوت و تحقیق کا پورا فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔

اردو کے ابتدائی مطالعہ اور طالب علمی کے
اس ابتدائی دور میں جس کتاب کو اپنے شوق سے
پڑھا، اور جس نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ
قاضی سلیمان صاحب منصور پوری مرحوم کی ــــ
"سیرت رحمۃ للعالمین" کا پہلا حصہ ہے، مجھے یہ
کبھی نہیں بھولے گا کہ جب اس کی دونوں جلدوں
کا بعض دوسری کتابوں کے ساتھ وی۔پی پر لئے
ہوئے آیا ہے۔ اور اس کے چھڑانے کے لئے اس
وقت روپیہ نہ تھا، تو میں نے بے اختیار رونا شروع
کیا، یہاں تک کہ کسی نہ کسی طرح اس کا انتظام کیا گیا،
اور کتاب میرے ہاتھ میں آئی، بار بار پڑھی، کئی جگہ
اور کئی بار اپنے دل اور آنکھوں کو قابو میں نہ رکھ سکا

بعض خاص مقامات کا ہمیشہ خاص اثر پڑتا تھا ، اسلام کے ابتدائی مبلغین کے واقعات حضرت مصعب ابن عمیرؓ کی مدنی زندگی کا مقابلہ، ان کی والہانہ کیفیت ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ منورہ میں تشریف آوری ، اور حضرات انصار کی مسرت ، استقبال اور جان نثاری ، انصار کا ایثار اور مہاجرین کے ساتھ ان کی دینی محبت ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے واقعات و حالات کا دل پر خاص اثر پڑتا تھا ، ٹہل ٹہل کر ان کو پڑھتا تھا لوگوں کو سناتا تھا ، اور اسی زندگی کی تمنائیں دل میں پیدا ہوتی تھیں ، قاضی سلیمان صاحب کے درجات اللہ بلند فرمائے ، اس عالم میں ہوتے تو کہتا کہ آپ کی کتاب کا مجھ پر بڑا احسان ہے ، اس نے سب سے پہلے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے اس مزہ سے آشنا کیا ، جس کے بغیر یہ زندگی خاک ، اور عالم خس و خاشاک ہے ۔

در جہان کائنات کردیم تنگ
یک دانہ محبت است باقی ہمہ کاہ

انہیں دنوں کے کچھ بعد میرے ہاتھ میں مولانا شبلی مرحوم کی " الفاروق " آگئی ، مطبع نامی ، کانپور کی چھپی ہوئی سراپا تصویر پڑھی اور کئی بار پڑھی ، عراق کی جنگوں بویب ، جسر ، قادسیہ وغیرہ کے میدان جنگ کی تصویر مولانا نے جن چھوٹے چھوٹے بے ساختہ و برجستہ جملوں میں کھینچی ہے ، شاید اس سے زیادہ اثر فردوسی " شاہنامہ " میں مسلسل اشعار اور پرشکوہ الفاظ اور مبالغہ سے پیدا نہیں کرسکا ، " الفاروق " کے جان دار اور گرم جملے اور لفظ شمشیر و سنان کا کام کرتے ہیں ، مولانا نے نظام خلافت پر جو کاوش کی ہے ، اس کے سمجھنے کی اس وقت صلاحیت نہ تھی ، اور اب اس سے کوئی دلچسپی اور علمی تاثر نہیں ہے ، لیکن واقعات کے حصہ کا اثر اس وقت بھی تھا ، اور اب بھی ہے ۔

مولانا کی دوسری کتاب جو اسی دور میں پڑھی ، " سفرنامہ روم و مصر و شام " تھی ، اتفاق سے یہی دو کتابیں ہمارے گاؤں کے محدود ذخیرۂ کتب میں تھیں ، آخر الذکر کتاب سے معلومات میں بڑا اضافہ ہوا ، ذہن میں وسعت پیدا ہوئی ، اور کیا عجب ہے کہ اول اول اسی کتاب سے دنیائے اسلام کی سیاحت کا شوق پیدا ہوا ہو ، جس کی نوبت برسوں بعد آئی ، کچھ عرصہ بعد مولانا کی سوانحی تصنیفات " الغزالی " ، " سوانح مولانا رومؒ " اور " المامون " پڑھی ، غالباً اسی وقت سے ذہن نے یہ اثر قبول کیا ، کہ سوانح حیات اور غیر ارادی طریقہ پر ان تذکروں اور " تاریخ دعوت و عزیمت " کے سلسلہ میں جو راقم کے قلم سے نکلا ، اس کو اختیار کیا گیا ، افسوس ہے کہ " شعر العجم " کے پڑھنے کی نوبت بہت بعد میں آئی ، جسکو میں اپنے ذوق پر ستم اور مولانا کا شاہکار سمجھتا ہوں ، اس تاخیر میں غالباً میری فارسی کی کم لیاقتی کو دخل تھا ۔

عم محترم مولانا سید طلحہ صاحب حسنی مرحوم ایم - اے استاد اورینٹل کالج لاہور کی صحبت اور

مجلسوں میں "آب حیات" سے تعارف ہوا، یہ بھی
اور بار بار پڑھی، یہاں تک کہ اس کے بہت
سے مضامین مستحضر ہو گئے۔ اشخاص، شعراء اور
ان کا کلام دماغ پر اس طرح نقش ہو گیا، جس طرح
بچپن کی دیکھی ہوئی چیزیں، اور سنی ہوئی باتیں
ذہن پر مرتسم ہو جاتی ہیں، اور ان کا دماغ پر
کوئی بار نہیں ہوتا۔ "گل رعنا" گھر کی کتاب تھی
اسکو اتنی بار پڑھا کہ اردو شاعری کی تاریخ، اور
شعراء کے متعلق اتنی معلومات ہو گئی کہ اس موضوع
پر مجلس میں گفتگو کرنے اور گفتگو میں حصہ لینے کی
استعداد پیدا ہو گئی۔

میرے حقیقی ماموں زاد بھائی مولوی سید
ابو الخیر صاحب برقؔ لکھنؤ کی ٹکسالی زبان لکھتے
اور بولتے تھے۔ لکھنؤ کے محاورات، اور صحت
و صفائی زبان میں وہ سند کا درجہ رکھتے تھے۔
سخن شناس بھی تھے اور سخن سنج بھی، ابتداءً میں
شمس لکھنوی کو کلام دکھاتے تھے، پھر آغا ثاقب
قزلباش لکھنوی کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو گئے،
اور انہیں کے رنگ کی پیروی کی، ان کی صحبت
میں زبان کا ذوق، اور اچھے برے کی تمیز پیدا
ہوئی، ان کے چھوٹے بھائی حافظ سید حبیب الرحمٰن
جامعہ ملیہ میں پڑھتے تھے، ان کو اردو شعر و شاعری
کا بڑا شوق تھا، ان کا ایک خاص ذوق یہ تھا کہ
بچوں سے اساتذہ کے اشعار کا مطلب پوچھتے
اور اردو میں تقریر و تحریر کے مقابلے کرواتے۔
اس سلسلہ میں خاص طور پر مومنؔ، غالبؔ، ذوقؔ
اور لکھنؤ کے شعراء میں سے آتشؔ اور امیر مینائی کے
کلام سے ان کو خاص ذوق تھا، چنانچہ ان کے اشعار
سننے اور ان کا مطلب بیان کرنے کے سلسلہ میں
دماغ پر زور ڈالنے، اور مشکل اشعار کے سمجھنے
کی عادت پڑی، اس زمانہ میں اودھ میں مشاعروں
کا بڑا زور تھا، ہمارے چھوٹے گاؤں میں کئی مشاعرے
ہوئے، دیکھا دیکھی میں نے بھی کچھ موزوں کرنے کی
کوشش کی، مگر اللہ تعالیٰ بڑے بھائی صاحب کو جزائے
خیر دے کہ انہوں نے بہت سختی سے روک
دیا، اور یہ شغل بے حاصل جاری نہ رہ سکا۔

رائے بریلی میں گھر میں بعض عزیزوں کا ذخیرۂ
کتب تھا جس میں مولوی محمد حسین آزاد کی "نیرنگ خیال"
بھی تھی، عمر کے اس ابتدائی دور اور زبان و ادب
کے اس ابتدائی ذوق میں آزاد کی نثر کا جو نثر اردو
کا ایک مرصع نمونہ ہے، بہت اثر پڑا۔ بہت دنوں
تک "نیرنگ خیال" اور "آب حیات" کی تقلید
میں بہت سے صفحے سیاہ کئے، جو اپنی کم سوادی
کے باوجود فائدہ سے خالی نہیں رہے، یہ زمانہ ہر
چھپی ہوئی چیز کے پڑھنے کے مرض کا تھا، ہر قسم کی
چیزیں پڑھیں، شرر مرحوم، اور رتن ناتھ سرشار
کی بھی چند کتابیں پڑھیں، کہتے ہیں کہ کوئی پڑھی ہوئی
چیز خواہ بھلا دی جائے، بیکار، و بے اثر نہیں رہتی
اپنا اچھا برا اثر ضرور کرتی ہے، اس لئے اس کا دعویٰ
نہیں کیا جا سکتا، کہ وہ نقش آنکھوں سے آگے نہیں

پڑھتے پائے، لیکن ان کا کوئی خاص اثر یاد نہیں آتا۔

اردو مضمون نویسی میں ابتدائی اثر والد مرحوم کی کتاب "یادِ ایام" کا تھا، جو سنجیدہ زبان کا ایک شگفتہ نمونہ ہے اور جس میں تاریخ کی متانت کے ساتھ، زبان کا بانکپن بھی موجود ہے، جو میرے علم میں مصنف "گلِ رعنا" اور نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کی تحریر کا مشترک جوہر ہے، اس طرز پر میرا پہلا مضمون جو اب یاد آتا ہے "اندلس" پر تھا۔

عربی تعلیم شروع ہو جانے کے بعد میرے استاد شیخ خلیل ابن محمد بن شیخ حسین یمنی (محدث بھوپال) نے ہمیشہ کے لئے دل پر توحید کا نقش قائم کرنے کے لئے سورۂ زمر بڑی توجہ اور ذوق و شوق سے پڑھائی، عربی ادب، اور بالخصوص عربی شعر کا عرب صاحب مرحوم کو اللہ نے ایسا فطری ذوق بخشا تھا جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ وہ اس قوم کے فرد تھے، جس کے متعلق زبانِ نبوت نے شہادت دی ہے، کہ ایمان اس کے گھر کی دولت ہے، (الایمان یمان) عجم کا "حسنِ طبیعت" نانی ال سے اور عرب کا "سوزِ دروں" انہوں نے دادی ال سے پایا تھا، قرآن مجید پڑھتے تھے تو خود بھی روتے تھے، اور دوسروں کو بھی رلاتے تھے، قصائد پڑھتے تھے تو شوق عکاظ کا نقشہ کھینچ دیتے تھے، توحید ان کا ذوقی مضمون تھا، دل کھول کر پڑھایا، اور دل کو توحید کے لئے کھول دیا، وہ دن ہے اور آج کا دن، اللہ تعالیٰ کا ہر طرح ہزار شکر ہے۔ "الا للہ الدین الخالص" (سورہ زمر) کا نقش قائم ہے۔ اور اس کے سامنے "ما نعبدہم الا لیقربونا الی اللہ زلفیٰ" (زمر)۔ (مشرکین کہتے ہیں کہ ہم اپنے معبودوں کی عبادت محض اس لئے کرتے ہیں کہ وہ ہم کو خدا کے قریب کر دیں) کا حیلہ اور دعویٰ، جو ہمیشہ سے نظامِ شرک کا سب سے بڑا فلسفہ ہے، تارِ عنکبوت معلوم ہوتا ہے، ادب میں شیخ خلیل عرب کا ایک مجتہدانہ نصاب تھا جو ہندوستان میں بالکل نیا تھا، ان کو اپنا ذوق تلامذہ کی طرف منتقل کرنے میں خاص کمال تھا، انہوں نے مبادی صرف اور تحریر و انشاء کی مشق کے ساتھ معروف بیروت کے سلسلۂ قرأت (ایڈرس) للغۃ العربیۃ، الطریقۃ المبتکرۃ، ۵ اجزاء، مدارج القراءۃ ۱ جزء کے بعد ابن المقفع کی "کلیلہ و دمنہ"، "مجموعۃ من النظم والنثر" حصہ نثر کا ایک حصہ حفظاً اور حصہ نظم، نہج البلاغۃ حصہ کتب، اور نظم میں حماسہ، اور معری کی سقط الزند اور دلائل الاعجاز جرجانی بڑے ذوق و جوش سے، نیز مختصر تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ پڑھائی، عربی کے قواعد زبان کی مشق میں سب سے بڑا احسان اس گمنام کے نامور بنام ابو الحسن علی العزیزیہ کے رسالۂ العزیزیہ کا ہے، جو چند اوراق کی کتاب ہے، عرب صاحب نے اس کی عملی مشق کرائی، اور یہی مشق اس وقت

تک کام آرہی ہے، اس تعلیم کی ایک خصوصیت یہ تھی، کہ اس میں ایک وقت میں مختلف علوم و فنون اور زبانوں کی تعلیم نہ تھی، صرف عربی زبان وادب کی تعلیم تھی اور وہی اوڑھنا بچھونا، وہی مقصود حیات اور وہی ذوق طبع۔

عرب صاحب کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اپنے محبوب و منتخب مصنفین، اور ان کے محبوب و منتخب تصنیفات کو اسطرح طلبہ کے سامنے پیش کرتے تھے، گویا وہی زبان وادب اور طرز ادا کا واحد نمونہ اور ادب و ذوق کا منتہیٰ ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ وہ مصنفین طلبہ کے دماغ اور تخیل پر حاوی ہو جاتے تھے، اور طالب علم ان کا رنگ اتارنے لگتے تھے، ابن المقفع، اور جاحظ نثر میں، عبد القاہر جرجانی ذوق، نقد ادب اور سخن فہمی میں، متنبی و بحتری شعر میں ان کے منتخب رنگ تھے، اس لئے ان کے طلبہ اپنی بڑی سعادت اور کمال سمجھتے تھے کہ ان میں ان کا رنگ اور انداز پیدا ہو جائے، راقم الحروف نے ابن المقفع، اور صاحب نہج البلاغۃ، نیز کبھی کبھی جرجانی کی تقلید میں لکھنے کی کوشش کی، اور اس کا بڑا فائدہ ہوا، عرب صاحب کا ایک تعلیمی نکتہ یہ بھی تھا، کہ وہ طلبہ کے دماغ پر یہ نقش قائم کر دیتے تھے، کہ ادب و شعر کا ترکہ صاحب ذوق طلبہ کی میراث ہے، جس کے استعمال کرنے اور اس سے فائدہ اٹھانے میں انہیں باک نہیں ہونا چاہیئے، چنانچہ ان کی ہمت افزائی سے کبھی کبھی ان صاحب طرز انشاء پردازوں کے بعض بعض جملے اور تعبیریں اپنی تحریر میں نگینہ کی طرح جڑ کر انعام حاصل کیا،

اس تعلیم کے انتہائی مرحلہ پر مصر کے مشہور صاحب طرز نثار سید مصطفیٰ لطفی المنفلوطی کی کتاب "النظرات" عرب صاحب نے دیکھنے کو دی، نتیجہ یہ ہوا کہ اس صدی کا یہ ساحر ادیب دماغ اور تخیل پر چھا گیا اور دل میں سما گیا، اس کے عنوانوں پر اپنے مضامین لکھے اور تیز رفتار رہوار کے پیچھے دوڑ کر دور تک خاک اڑائی۔

میری بڑی خوش قسمتی تھی کہ حدیث میں مولانا حیدر حسن خاں صاحبؒ جیسا متبحر استاد نصیب ہوا، جو مولانا غلام احمد صاحب لاہوری، مولانا لطف اللہ صاحب کوئلی، مولانا احمد حسن صاحب کانپوری اور شیخ الاسلام شیخ حسین یمنی کے شاگرد، اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کے مجاز تھے، یہ بھی خوش قسمتی تھی کہ حدیث کی تعلیم شروع ہوئی، تو کوئی دوسرا فن اور موضوع مزاحم نہ تھا، صرف حدیث کے اسباق تھے، مولانا کی صحبت تھی، دار العلوم ندوۃ العلماء کے طلبہ تھے۔ اور ندوۃ العلماء کا نادر علمی ذخیرہ اور مولانا کے علمی مآخذ تھے۔

مولانا کے یہاں تعلیم کی دو سری خصوصیتیں تھیں جن کی وجہ سے فن کا ذوق اور اس کا کچھ (بہ قدر استعداد و توفیق) عملی ملکہ حاصل ہو جایا کرتا تھا، ایک یہ کہ

تعلیم بالکل ناقدانہ اور محدثانہ اصول پر تھی، مولانا کو مذہب حنفی پر کلیتہً اطمینان تھا، اور وہ اس کے زبردست وکیل و ترجمان تھے، لیکن ان کا درس حدیث محدثانہ طرز اور نقد حدیث، اصول حدیث و رجال کی بحثوں پر مبنی تھا، اور اس میں ہندوستانی طرز تدریس حدیث سے زیادہ یمنی طرز حدیث، اور شوکانی کے طرز تالیف کا اثر تھا، شوکانی کی تالیف "نیل الاوطار" اس کا ایک نمونہ ہے، محدثین میں خصوصاً ابراہیم الوزیر محمد بن اسماعیل الامیر، اور علامہ مقبلی کی تالیف، اور اصول حدیث کے بعض نوادر ان کے خاص مآخذ تھے، جن میں "تنقیح الانظار" اور "توضیح الافکار" کے قلمی متن و شرح کے مسودات خاص طور پر قابل ذکر ہیں، دوسری چیزوں کے مقابلہ میں علامہ ابن الترکمانی کی "الجوہر النقی" امام زیلعی کی "نصب الرایہ" سے بہت مدد لیتے تھے، اور حدیث صحیح کا جواب حدیث صحیح سے اور نقد حدیث کے مسلم اصول و مجتہدانہ مباحث سے دیتے تھے، دوسری چیز یہ کہ ان کا درس عملی تھا جس میں طالب علم استاد کے ساتھ شریک عمل ہوتے تھے، مولانا طلبہ ہی سے کتابوں کے نقول، مذاہب کے دلائل، رجال پر نقد و جرح کی بحثیں نکلواتے تھے، اس طرح تدریس و تالیف کا سلیقہ سکھاتے تھے۔

درس حدیث میں عملی طور پر سب سے زیادہ فائدہ امام نوویؒ کی شرح مسلم سے ہوا، جو ایک مبتدی طالب علم کے لئے بڑا اچھا استاد ہے، شروح حدیث کے فائدے اٹھانے اور زمین پر زور ڈالنے کا ملکہ اسی سے پیدا ہوا، "فتح الباری" سے استفادہ کی اصل نوبت تدریس کے زمانہ میں ہوئی، اس وقت حافظ ابن حجر کی وسعت نظر، فن حدیث پر ان کی قدرت، اور اس کے وسیع ذخیرہ پر ان کا احتواء دیکھ کر آنکھیں کھل گئیں، یہ کتاب مسلمانوں کا ایک علمی کارنامہ ہے، جس کی نظیر سے دوسری قوموں کا مذہبی ذخیرہ خالی ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے کہیں وجد و سرور کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، قلبی طور پر سب سے زیادہ اثر "ابوداؤد" کی کتاب الادعیہ اور "ترمذی" کی کتاب "الزہد والرقاق" نے ڈالا۔

اسی زمانہ میں "احیاء العلوم" دیکھنے کا شوق ہوا اور اس نے دل پر بجلی کا سا اثر کیا، مگر یہ مطالعہ جاری نہیں رہ سکا، اس میں بڑے بھائی صاحب کی بصیرت کو دخل تھا جن کے نزدیک اس کے مطالعہ کے شغف سے بعض غیر معتدل رجحانات کے پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔

۱۹۳۰ء میں شیخ خلیل عرب کی تجویز اور بھائی صاحب کی دعوت پر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تدریس ادب کے لئے ایک فاضل و محقق صاحب زبان مراکشی عالم تشریف لائے، یہ علامہ شیخ تقی الدین ہلالی تھے، جن کو اگر نہ دیکھا ہوتا تو عربی زبان و ادب کے بہت سے مبادی و بدیہیات

زبان کی تعلیم کے بہت سے حقائق و اصول نظر سے ہمیشہ اوجھل رہتے، اور تقلید و جمود کے اثر سے کلیۃً آزادی نصیب نہ ہوتی، ان کو اگر نہ دیکھا ہوتا، تو قرن ثانی و ثالث کی زبان کو مردہ اور صرف کاغذ کے نقش و نگار سمجھتے، اس ایک شخص میں سلف کی احتیاط اور علمی تورع (عدم تحقیق کی حالت میں بے تکلف لاادری کہہ دینا) مغرب اقصیٰ خصوصاً اہل شنقیط کا حفظ و استحضار، اہل سنت کا اتقان، علمائے نحو کی پختگی، اور اہل زبان کی شیریں زبانی اور خوش گفتاری جمع تھی، بات کرتے تھے تو منہ سے پھول جھڑتے تھے، ہر جملہ ادب کی جان ہوتا تھا، جس کو آدمی جس ادب کی کتاب کے حاشیہ پر چاہے لکھ لے، میں نے "اغانی" اور "جاحظ" کی کتابوں کی زبان بولتے ہوئے ان کے سوا کسی کو نہیں سنا، یہ کہتے تھے، وہی بولتے تھے، اور یہ بولتے تھے وہی عربی زبان کا روز مرہ اور محاورہ ہے۔

ہلالی صاحب سے عربی ادب و شعر کی کتابیں پڑھنے کی بھی سعادت حاصل ہوئی، لیکن اس سے زیادہ مفید ان کی صحبت اور مجالس و سفر کی رفاقت تھی، ان کی صحبت و افادات سے دو حقیقتیں پہلی بار منکشف ہوئیں، ایک تو یہ کہ زبان، اور ادب میں فرق ہے، زبان وہ ہے جو ادب کی بنیاد ہے، ادب زبان کی بنیاد کے کاخ و ایوان اور زبان کی دیوار کے نقش و نگار ہیں۔ ادب خیالات کے اظہار کا بلند اور فنی اور ترقی یافتہ ذریعہ ہے، جو تمدن و تخیل کی ترقی سے پیدا ہوتا ہے، زبان کی تعلیم و تربیت ادب کی تعلیم پر مقدم ہے، اگر زبان نہیں آتی تو ادب نہیں آسکتا اور اس کی قبل از وقت تعلیم ضیاع وقت ہے، ہندوستان میں زبان کے دھوکے میں اور عربی زبان کے نام سے اعلیٰ عربی ادب کی تعلیم دی جاری ہے، جو اکثر اوقات بے بنیاد اور بے نتیجہ ثابت ہوتی ہے۔ ہلالی صاحب کہتے تھے کہ "حریری" اور "متنبی" و "حماسہ" ادب عربی کی اعلیٰ کتابیں ہیں، جو بلاد عربیہ میں زبان کی طویل اور مسلسل تعلیم اور زبان کی مشق کے بعد پڑھائی جاتی ہیں، اور عربی ادب کی تکمیل کرنے والے فضلاء ان کو پڑھتے ہیں، لیکن ہندوستان میں یہی کتابیں ادب کا کل سرمایہ اور مبلغ ہیں، ضرورت ہے کہ ان سے پہلے زبان کو ایک زندہ زبان کی طرح پڑھایا جائے، ان کا یہ بھی اصرار تھا کہ زبان کو انسانی زبان کی طرح بغیر ترجمہ کی مدد کے پڑھنا چاہئے، اس پر شیخ نے بلاد اسلامیہ میں مسلسل تقریریں کیں، اور اپنے مدعا کو دلائل سے ثابت کیا۔

دوسری حقیقت یہ منکشف ہوئی کہ صرف نحو کے قواعد زبان کی تشکیل کے اصول ہیں، جن کا درجہ زبان کے بعد ہے، زبان کا ذخیرہ اگر کچھ نہیں تو صرف و نحو کے قواعد بے کار ہیں، مفردات،

الفاظ وجمل مسلمان کی اپنی ہیں، اور نحو کا علم اصول
تعبیر کے قواعد اور انجینیری کا فن اگر سرے سے
اپنی نہ ہوں تو انجینیرنگ اور اصول تعبیر کا پڑھے
سے بڑا علم ناکارہ اور فضول ہے۔

ہلالی صاحب سے یہ بات بھی معلوم ہوئی
کہ زبان کا بہترین نمونہ تاریخ کی مستند کتابیں اور
عہد عباسی کے ادباء کی غیر مصنوعی تصنیفات ہیں،
اس کے لئے انہوں نے ابن قتیبہ کی "الامامة والسیاسة"
ابن المقفع کی "کلیلہ ودمنہ" ابوالفرج الاصبہانی کی
کتاب "الاغانی" اور جاحظ کے رسائل کی سفارش
کی ——

یہ زمانہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں عربی کی بہار
کا تھا، ادھر ہلالی صاحب کا فیض عام تھا، ادھر
ہمارے دوست مولانا مسعود عالم ندوی عربی کا رسالہ
"الضیاء" نکال رہے تھے، عربی زبان و تحریر،
نقد و تبصرہ گویا اوڑھنا بچھونا ہو رہا تھا، مصری، شامی
عراقی اور مغربی (الجزائری و مراکشی) رسائل وجرائد
تبادلہ میں آتے تھے، پڑھے جاتے تھے۔ اور ان
پر گفتگو رہتی تھی، یہ میرے عربی اخبار بینی کی عمر کا بچپن تھا
عربی ادب کی کتابیں پڑھ لینے، اور عرب اساتذہ کی
صحبت میں رہنے کے باوجود اخبارات کا بڑا حصہ
سمجھ میں نہ آتا، اس لئے نہیں کہ ہندوستانی علماء
کے بقول (جو سراسر غلط فہمی ہے) یہ کسی جدید عربی
میں ہوتے تھے بلکہ طرز ادا، اور اشتقاق کی ناواقفیت
کی وجہ سے سمجھ میں نہیں آتے تھے، ہلالی صاحب
کی مدد سے میں نے اخبار پڑھنا شروع کیا اور اس
سے جتنا فائدہ اصول تعبیر، اور اظہار خیال میں مجھے قدرت
حاصل ہوئی، ادب و زبان کی کسی کتاب یا کتابوں سے
نہیں ہوئی۔

مصری و شامی ادباء و فضلاء کے مضامین پڑھ
کر ان کی فصاحت، زبان کی قدرت کا سکہ دل پر
بیٹھا، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عربی زبان کے خزانہ
عامرہ کے وارث جو صدیوں سے سربمہر تھے، وہ اچھے
اخبارات و رسائل کے کھلے صفحات میں روزانہ لٹاتے
ہیں، اور امیر شکیب ارسلان کے بقول عہد عباسی
کا ایک ادیب برسوں میں جتنا لکھتا تھا، وہ اس
عصر کا عرب ادیب و صحافی چند دنوں میں لکھ دیتا
ہے، لیکن معنوی و ذہنی حیثیت سے ذوق و دماغ
پر ان مضامین کا کوئی اچھا اثر نہیں پڑا، اور ہمارے
ہندی ذوق نے جس نے ہندوستان میں کچھ زیادہ
سنجیدہ، زیادہ گہرے اور زیادہ خالص اسلامی
ادبیات اور ماحول میں نشوونما پائی تھی، عربوں کے
قوم پرست اور وطنی افکار، مغرب سے ذہنی
مرعوبیت، اور خیالات کی سطحیت کے خلاف
ہمیشہ احتجاج کیا، اور ذہن نے اس کی پستی اور کمزوری
صاف محسوس کی، ان مضامین کو میں نے ہمیشہ روحانی
اذیت اور ذہنی کوفت کے ساتھ پڑھا، اس حیثیت
سے امیر شکیب ارسلان کی تحریروں اور خیالات
میں نسبتاً کچھ گہرائی اور پختگی اور اسلامیت معلوم ہوئی
لیکن امت اسلامیہ کے امراض کی تشخیص اور علاج

کی تحریروں میں اس وقت جس شخص کے خیالات و افکار
میں نسبتاً زیادہ بلند نظری اور باریک بینی معلوم ہوئی،
اور جس کی فراست نے متاثر کیا وہ سید عبدالرحمٰن
الکواکبی کی تمثیلی کتاب "ام القریٰ" ہے، جو اب پرانی
ہو چکی ہے، اور اس کے لائق مصنف کو لوگ
بھولتے جا رہے ہیں، لیکن بعد میں یہ دیکھ کر کہ وہ
قومیت عربیہ کے اولین نقیبوں میں ہیں، اور انہوں
نے سب سے پہلے دولت عثمانیہ کے خلاف عربوں
میں بیزاری پیدا کرنے کی کوشش کی، دل میلا ہو گیا
اور عقیدت میں کمی آئی۔

۱۹۲۵ء یا ۱۹۲۶ء میں رسالہ توحید امرتسر
میں جو مولانا داؤد غزنوی مرحوم کی ادارت میں نکلتا
شروع ہوا تھا "تیرھویں صدی کا مجدد اعظم" کے
عنوان سے حضرت سید احمد شہید کے متعلق مولوی
محی الدین قصوری مرحوم کا ایک سلسلۂ مضمون شائع
ہوا، بھائی صاحب کے حکم سے ۱۹۲۹ء یا ۱۹۳۰ء
میں میں نے اس کا عربی میں آزاد ترجمہ کیا جو ہلالی صاحب
کی اصلاح کے بعد علامہ سید رشید رضا مرحوم نے
"المنار" میں بھی شائع کیا، اور "ترجمۃ السید الامام احمد
بن عرفان" کے نام سے علیحدہ رسالہ کی شکل میں بھی
چھاپ دیا، اس موضوع سے یہ میرا پہلا تعلق تھا۔

میری مدرسی تعلیم کا اختتام ہو چکا تھا، اور
آزاد مطالعہ کا آغاز، حافظ ابن قیمؒ کی "زاد المعاد"
میرا کتب خانہ، میری رفیق سفر اور میری گویا اتالیق
و معلم تھی، دینیات کے کتب خانہ کی اتنی بہتر نمائندگی
ایک کتاب میں ملنا مشکل ہے، اگر مجھے کبھی پورے
ذخیرۂ علمی سے محروم کر دیا جائے، اور صرف دو
کتابوں کی اجازت دی جائے، تو میں کتاب اللہ
اور زاد المعاد اپنے ساتھ رکھوں گا، اس نے مجھے
نماز سکھائی، دعائیں اور اذکار یاد کرائے، سفر کے
آداب بتائے، روزمرہ زندگی کے مسنون قواعد و
احکام سکھائے، اور سنت کا ذوق علم بخشا۔

ابتدائے شباب میں جو کتابیں فرشتۂ رحمت
بن کر سامنے آئیں، ان میں سب سے زیادہ موثر
اور محسن کتاب محمد بن نصر المروزی کی کتاب "قیام اللیل"
ہے، اس کتاب کا خاص کام یہ ہے کہ عقلی اور استدلالی
طریق سے نہیں، بلکہ قلبی اور ذوقی طور پر دلچسپی اور
شوق کا رخ بدل دیتی ہے، اور سارا کھیل دلچسپی
اور انس ہی کا ہے، اس کتاب میں شب بیدار
نوجوانوں کے ایسے موثر واقعات لکھے ہیں، اور
قرآن مجید کی بعض آیات کی اتنی پر اثر تفسیر، اور
قیام لیل کے فضائل جمع کئے ہیں جو اگر کسی خوش قسمت
نوجوان کو آغاز شباب میں مل جائیں، اور اپنا اثر کر
جائیں، تو ایک شیخ کامل کی بیعت سے کم نہیں۔

امام ابن تیمیہؒ کی تفسیر سورۃ النور نے بھی اس
پر آشوب زمانہ میں دستگیری کی ہے اور حافظ ابن قیمؒ
کی "الجواب الکافی" نوجوانی میں بہترین نگران اور
اتالیق، اور اخلاقی محتسب و ناصح رہی، زمانۂ تعلیم
کے بے شعور دور میں جس کتاب نے تعلیم سے اور
معلمین سے نفع اٹھانے اور ان کے احترام اور

طالب علمی کے آداب کا لحاظ کرنے کا خیال پیدا کیا، وہ صاحب ہدایہ کے ایک شاگرد کی چھوٹی سی کتاب تعلیم المتعلم ہے، اسی طرح تحصیل علم میں علوئے ہمت، عزیمت، اور ذوقِ علم پیدا کرنے میں نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی کتاب "علمائے سلف" نے مہمیز کا کام دیا، اور دل و دماغ پر علمائے سلف کی عظمت و عزیمت کا نقش ثبت ہو گیا، میرے نزدیک ہر سچے طالب علم کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیئے اور اسکو حرزِ جان بنا کر رکھنا چاہیئے۔

والد مرحوم مولانا حکیم سید عبدالحیٔ صاحب سابق ناظم ندوۃ العلماء کی تصنیفات کو الٹتے پلٹتے، ان کا ایک مسودہ "ارمغانِ احباب"[1] کے نام سے ہاتھ لگ گیا، جو انہوں نے اپنی ۲۶ سال کی عمر میں لکھا ہے، اور ۱۳۱۲ھ کے طالب علمانہ سفروں کا روزنامچہ ہے، نہایت سادہ اور بے تکلف لیکن اس نے میرے دل پر بڑا اثر کیا، مردانِ خدا کی محبت اور دین کی چاشنی محسوس ہوتی، حضرت سید احمد شہیدؒ سے اصل قلبی تعلق اسی رسالہ سے پیدا ہوا، جہاں والد مرحوم حضرت سید نا لکھتے ہیں وہاں دل جھوم جاتا تھا۔ اور دل ایک خاص کیفیت محسوس کرتا تھا ـــــ۔

دوسری چیز جس نے حضرات اہل اللہ کی محبت و عقیدت پیدا کی اور دین کا ایک خاص مزہ معلوم ہوا جس کو الفاظ میں ادا کرنا مشکل ہے، حضرت مولانا محمد علیؒ بانی ندوۃ العلماء کا چھوٹا سا رسالہ ارشاد رحمانی ہے جس میں شیخ وقت مولانا فضل رحمٰن صاحب گنج مراد آبادیؒ کے کچھ حالات، حکایات و ملفوظات اور سلوک و طریقت کے کچھ نکات ہیں۔ حضرت مولانا گنج مراد آبادیؒ میرے والد مرحوم کے شیخ تھے، اور بچپن سے گھر میں آپ کا ذکر خیر سنا تھا اس روحانی تعلق اور ذہنی رابطہ سے کتاب ذوق و شوق سے پڑھی، محبت کے اشعار، اور عاشقانہ کلمات دل میں چبھ گئے، اور تیر و نشتر کی طرح دل میں اتر گئے، اس سے کچھ پیشتر یا بعد والد مرحوم کا ایک مختصر سا رسالہ یا مقالہ جو "استفادہ" کے نام سے شائع ہوا تھا، بار بار پڑھا تھا، اس میں انہوں نے اپنے گنج مراد آباد کی حاضری کے حالات، اور وہاں کے مشاہدات، اور مولانا کے الطاف و عنایات کے واقعات قلم بند کئے تھے، اس نے مولانا کی محبت و عقیدت، اور اہل اللہ سے ملاقات اور استفادہ کے شوق میں اور اضافہ کیا۔

مشائخ و بزرگان دین کے ملفوظات کے مجموعے بھی نظر سے گزرے، ان مجموعوں میں

---

[1] یہ سفرنامہ پہلے رسالہ "معارف" اعظم گڑھ میں بالاقساط شائع ہوا۔ پھر انجمن ترقی اردو دہلی، اور مکتبہ ندوۃ العلماء کی طرف سے دہلی اور اس کے اطراف "کے نام سے شائع ہوا۔

حضرات چشتیہ کے ملفوظات میں سب سے زیادہ محبوب الٰہی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے ملفوظات "فوائد الفواد" اور حضرات نقشبندیہ کے ملفوظات میں حضرت شاہ غلام علیؒ کے ملفوظات "در المعارف" کا قلب پر اثر پڑا، اگرچہ ذہن نے حدیث کے اثر اور ایک خاص ذہنی تربیت و مطالعہ کی وجہ سے بعض باتوں کے قبول کرنے سے ادب کے ساتھ معافی چاہی، لیکن قلب نے واقعات، اور بے ساختہ گفتگو اور شوق کی گرمی و رنگی محسوس کی۔

فلسفۂ تصوف اور فلسفۂ اخلاق کے نکات و مباحث نے جو متاخرین صوفیہ کی کتابوں میں بکثرت ملتے ہیں، کبھی متاثر نہیں کیا، البتہ درد و محبت، اور سوز و گداز کی باتیں بے اثر نہیں رہتی تھیں، اور یہ تیر کم خطا جاتے تھے، درد و محبت میں ڈوبے ہوئے اشعار اور فقرے دل پر نقش اور حافظہ میں محفوظ ہو جاتے تھے ؎

ہم نے اپنے آشیانے کیلئے
جو چبھے دل میں وہی تنکے لئے

بزرگوں کی مجالس و ملفوظات کے سلسلہ میں تاریخی ترتیب کا لحاظ کئے بغیر یہ کہے بغیر آگے نہیں بڑھا جاتا کہ عرصہ کے بعد جب مولانا شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی بھوپالیؒ کی مجالس میں حاضری کا شرف حاصل ہوا، اور ان کی التفات و عنایات سے سرفراز ہوا، تو ان کی زبان سے دینی حقائق و نکات، اور سلوک و تصوف کی نادر تحقیقات سن کر عالم حیرت میں پڑ گیا، اللہ تعالیٰ نے ان کے ملفوظات و مجالس کے قلم بند کرنے کی توفیق بھی عطا فرمائی[1] اپنے علم و فہم کے مطابق یہ کہنے میں ذرا مبالغہ معلوم نہیں ہوتا کہ عرصۂ دراز سے تزکیہ و احسان، اور دینی حقائق کے سلسلہ میں ایسے بیش قیمت ملفوظات، اور ایسے گہرے علوم و حقائق سننے میں نہیں آئے ؎

والغیب عند اللہ

وفوق کل ذی علم علیم

طالب علمی کے باقاعدہ اختتام کے قریب ضلع رائے بریلی کے ایک مردم خیز قصبہ سلون جانے کا اتفاق ہوا۔ اور دو کتب خانے دیکھے، ایک زندہ و متکلم، ایک جامد و خاموش، زندہ کتب خانہ مولانا شاہ حلیم عطا صاحبؒ[2]، اور جامد کتب خانہ ان کا قیمتی علمی ذخیرہ، شاہ صاحب کے واسطہ سے حافظ ابن جوزی، حافظ ابن تیمیہ، حافظ ابن قیم، حافظ ابن رجب، اور ابن عبدالہادی وغیرہ کی بعض کتابیں دیکھیں، پھر وطن واپس جاکر "احیاء العلوم" مع تخریج عراقی "فضل علم السلف علی الخلف"، "دقائق الکنوز"، "تلبیس ابلیس"، "مختصر منہاج القاصدین" وغیرہ منگوائیں۔ تلبیس ابلیس کے مطالعہ سے ناقدانہ ذہنیت پیدا ہوئی ــــــ۔

---

[1] جلد ہی مجالس مکتبۂ الفرقان "لکھنؤ" کی طرف سے "صحبتے با اہل دل" کے نام سے شائع ہو گئی ہے اور اس وقت تک اس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

[2] آپ حضرت شاہ پیر محمد صاحب سلونی چشتی نظامی کی اولاد میں سے تھے، زندگی گوشہ گیری میں بسر کرنے کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تدریس حدیث کی خدمت قبول فرمائی اور کئی سال وہاں شیخ الحدیث رہنے کے بعد ۱۳۸۵ھ میں انتقال کیا۔

اب اس سے پہلے کہ میں اپنی آخری محسن و مؤثر کتابوں کا ذکر کروں، تاریخی ادوار کے لحاظ سے بعض ان کتابوں اور تحریروں کا ذکر کرتا ہوں، جنہوں نے بعض خاص حیثیتوں سے دل و دماغ پر کوئی اثر کیا اور کوئی قابلِ ذکر علمی فائدہ یا ذہنی تغیر پیدا کیا۔

نظام و نصابِ تعلیم کے متعلق اصلاحی و تجدیدی خیالات کا تخم شیخ خلیل عرب و شیخ تقی الدین الہلالی کی مجالس درس میں دماغ پر پڑا، دار العلوم ندوۃ العلماء کے ماحول اور لٹریچر نے اس کا نشوونما کیا، ندوۃ العلماء کا تخیل، دین و دنیا کی ہم آمیزی، اور علماء و اہل دین کی قیادت و اقتدار کی ضرورت و اہمیت کا احساس نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی کے اس خطبۂ صدارت سے وضاحت و قوت کے ساتھ ہوا، جو موصوف نے ندوۃ العلماء کے اجلاس ۱۹۲۴ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں پڑھا تھا، اور میں نے اسکو غور سے بعد میں چھپا ہوا پڑھا، پھر مزید مطالعہ سے اس پر یقین اور اطمینان بڑھتا رہا، اور یہ دونوں چیزیں میرے علمی عقائد و نظریات کا جزو بن گئیں۔

مغربی تہذیب و نظام سے نفرت اصل میں بڑے بھائی صاحب ڈاکٹر حکیم سید عبد العلی صاحب مرحوم بی۔ ایس۔ سی، ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کی صحبتوں اور مجلسوں میں پیدا ہوئی، جو اس سے براہِ راست واقفیت رکھتے تھے، اور اعلیٰ مغربی تعلیم کے باوجود اسکی سخت تنقید اور مذمت کرتے تھے۔ یوں بھی ان کی زندگی، اور ان کا سراپا قدیم اسلامی تہذیب و ثقافت کی نمائندگی اور مغربی ماحول کے اثرات کی شکست و ہزیمت کا اعلان کرتا تھا، اس نفرت کو جو زیادہ تر قلبی تھی، مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی کے "سچ" اور "صدق" کے پرچوں نے مستحکم اور دماغی بنا دیا۔

مغربی تہذیب کی تاریخ سمجھنے میں اور لادینیت و مادیت کے ارتقاء کی اس منزل کی ترجمہ میں ڈریپر کی پرانی کتاب "معرکۂ مذہب و سائنس" (مترجمہ مولانا ظفر علی خاں مرحوم) اور لیکی کی "تاریخ اخلاق یورپ" (مترجمہ مولانا عبد الماجد صاحب۔ دریابادی) سے بڑی مدد دی، اور اس سے بڑا مواد ملا جس سے اپنے مضامین و استدلال میں بہت کام لیا، مولانا سید ابو الاعلیٰ صاحب مودودی کے مضامین ترجمان القرآن اور ان کی کتاب "تنقیحات" نے اور زیادہ وضاحت و تقویت پہنچائی، مولانا ابو الاعلیٰ کے "ترجمان القرآن" کے مضامین نے طرزِ استدلال اور طرزِ تحریر پر بھی اثر ڈالا، اور ان کی تحریروں نے ذوق و فکر کو متاثر کیا۔

مغربی تہذیب کے مزاج اور اس کے حقیقی نقائص، اسلامی تہذیب سے اس کے بنیادی و اصولی تضاد اور دونوں کے اتحاد کے عدم امکان کے متعلق سب سے زیادہ واضح اور پُر مغز چیز محمد اسد صاحب کی کتاب (ISLAM AT THE CROSS ROADS) معلوم ہوئی، جس کا لفظ لفظ

دل نشین ہوا، عرصۂ دراز کے بعد ان کی دوسری فکر انگیز لیکن دلچسپ کتاب (Road to Mecca) شائع ہوئی، جس کا عربی ترجمہ "الطریق الی مکۃ" انہوں نے ازراہِ عنایت سے مجھے خود بھیجا، یہ اس اجمال کی تفصیل، اور اس نظریہ کی عملی تطبیق تھی، جو انہوں نے اپنی پہلی کتاب میں پیش کیا تھا، میں نے ان کی اجازت سے اسکا ترجمہ اور تلخیص "طوفان سے ساحل تک" کے نام سے شائع کیا، یہ کتاب پڑھنے کی چیز تھی، اور صاحبِ ذوق کے پڑھنے کی ہے۔

۱۹۳۸-۳۹ء میں مصر کے فاضل مؤلف ڈاکٹر احمد امین کی "فجر الاسلام" جلد اور ضحی الاسلام جلد ۲ کے مطالعہ کا موقع ملا۔ یہ عہد بنی امیہ اور عہد بنی عباس کی فکری، ادبی، اخلاقی، سیاسی و علمی تاریخ ہے جس میں واقعات سے نتائج اخذ کئے ہیں جزئیات سے کلیات قائم کئے ہیں اور ہر دور اور حیاتِ انسانی کے ان مختلف شعبوں پر گہری نگاہ ڈالی ہے، کتاب مصنف کی قوت مطالعہ، اور حسنِ استنتاج کا اچھا نمونہ ہے۔ اور اگرچہ موجودہ مصری و مغربی تاثرات سے کلیتہً پاک نہیں، اور اس کے مطالعہ سے ذخیرۂ حدیث پر اعتماد کی حد تک متزلزل ہو جاتا ہے اور اسکی بعض بنیادی شخصیتوں کے بارے میں وہ عظمت اور عقیدت قائم نہیں رہتی جو ایک مسلمان کے دل میں قائم رہنی چاہیئے، مگر میری سادہ لوحی کہیئے، یا ناقدانہ نظر کی کمی کہ مجھے مصنف کی اس کمزوری کا پورا احساس اس وقت نہیں ہونے پایا، اس کا صحیح احساس و علم اور اس سے اذیت اس وقت ہوئی جب میں نے ڈاکٹر الشیخ مصطفیٰ السباعی کی فاضلانہ کتاب "السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی" پڑھی جس کے مطالعہ کی سفارش فن حدیث کے ہر طالب علم سے ہے۔ اس کے باوجود ڈاکٹر احمد امین کے خیالات میں بڑا توازن معلوم ہوتا، کئی جگہ حواشی پر اختلاف یا اظہار خیال کیا، یا مصنف کو بے اختیار داد دی، لیکن سب سے زیادہ فائدہ جو ان کتابوں کے مطالعہ سے حاصل ہوا، وہ شگفتہ، شیریں اور علمی طرزِ تحریر کا ہے، جس میں احمد امین اپنے معاصرین میں خاص امتیاز رکھتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام کے تذکرہ سے امام احمد بن حنبل اور محدثین کی بڑی عظمت دل و دماغ پر قائم ہوئی، تذکرہ اور الہلال کے ادبی سحر حلال نے مسحور کیا۔ "ترجمان القرآن" کی دوسری جلد سے تفسیر اور فہم قرآن کے بعض نئے گوشے سامنے آئے، اور فکر میں وسعت پیدا ہوئی، سورۂ یوسف پر جو کچھ انہوں نے لکھا ہے وہ نہ صرف قرآنی نکتہ شناسی کی ایک مثال، بلکہ ادب عالی کا ایک زندہ جاوید نمونہ ہے۔

جب ترجمۂ قرآن اور تفسیر کی تدریس کی خدمت دارالعلوم میں سپرد ہوئی، تو مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کے حواشی کی قدر آئی، جن میں انہوں نے

مفسرین کے اقوال کا عطر اور ان کی تحقیق کا وہ
حصہ نقل کر دیا ہے، جسکو اس زمانہ کا سلیم ذہن
آسانی کے ساتھ قبول کر لیتا ہے۔ اس میں مولانا
کی سلامت فکر، حسن انتخاب، اور تحریر کی شگفتگی
بخوبی عیاں ہے۔ میں نے دیوبند کی ایک ملاقات
میں مولانا سے اپنا یہ تاثر ظاہر کیا، مولانا کو بڑی
مسرت ہوئی، اور بعض صاحبوں سے اسکو نقل کیا،

جدید معلومات و تحقیقات نے تفسیر کے
سلسلہ میں جو نئے سوالات پیدا کر دیئے ہیں ان
کا حل تلاش کرنے میں، اور قرآنی اعجاز کے بہت
سے گوشوں کو بے نقاب کرنے میں "تفسیر ماجدی"
اور اس کے مصنف مولانا عبد الماجد دریا آبادی
کے تفسیری مضامین و تحقیقات سے بڑی مدد
ملی۔ اور اپنے مطالعہ و معلومات میں حقیقی اضافہ ہوا۔

مولانا سید سلیمان صاحب ندویؒ کی تمام
تصنیفات نقد کامل عیار، اور علم و انشاء کے
لحاظ سے معیاری ہیں، لیکن اس بے بضاعت کو
جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ خطبات
مدراس تھے، اگر کسی مصنف کے حصہ میں صرف
یہی تصنیف آ گئے، تو اسکو زندہ جاوید بنا دے
اور اگر مقبول ہو، (جیسا کہ آثار سے بھی ظاہر ہے)
تو مغفرت کے لئے تنہا کافی ہے، بار بار مزے
لے لے کر پڑھی، حدیث و سیرت کے نئے
نئے پہلو سامنے آئے، اور اس عہد انقلاب میں
اہل علم اور تعلیم یافتہ غیر مسلموں کے سامنے حدیث و
سیرت پیش کرنے کی راہ معلوم ہوئی۔

مولانا سید مناظر احسنؒ گیلانی کی کتابوں میں
بڑے معلومات اور مواد ہوتے ہیں، بہت سے لوگوں
کو ان کے مخصوص طرز تحریر، اور بات سے بات
نکالنے کی وجہ سے جی نہیں لگتا، لیکن میرا ہمیشہ
ان کی کتابوں میں جی لگا۔ اور اپنے علم میں اضافہ ہوا
خاص طور پر ان کی کتاب "النبی الخاتم" سیرت پر
بڑی البیلی کتاب ہے، اسی طرح ان کی دوسری
کتاب "ہمارا قدیم نظام تعلیم و تربیت" بڑی
پر از معلومات اور موثر کتاب ہے، تیسری کتاب
"تدوین حدیث" بڑی مبصرانہ، اور نکتہ ورانہ تصنیف
ہے، ان کا مضمون "مجدد الف ثانی کا تجدیدی کارنامہ"
بھی بڑی بصیرت و معلومات کا ذریعہ بنا، اور اسی
سے ان کے دوسرے مقالے پر "الفرقان" "شاہ
ولی اللہ نمبر" میں شائع ہوا تھا، تاریخ ہند کے نئے
گوشے سامنے آئے۔

"حیات جاوید" "وقار حیات" اور "تہذیب الاخلاق"
کے پرانے فائل سے ہندوستانی مسلمانوں کے
موجودہ مزاج اور ان کے موجودہ تعلیمی و سیاسی
رجحانات کے سمجھنے میں بڑی مدد ملی، جسکی تکمیل
"حیات شبلی" سے ہوئی، مولوی سید طفیل احمد صاحب
کی "حکومت خود اختیاری" اور "مسلمانوں کا روشن
مستقبل" سے ہندوستان کی برطانوی سیاست
اور مسلمانوں کے سیاسی تنزل اور ذہنی تغیر کی توجیہ
ہوئی، ہندوستان کی اسلامی، دینی و علمی تاریخ کا سبب

بڑا خزانہ گھر میں موجود تھا، کبھی خیال نہیں آیا تھا،
حیدرآباد سے اشاعت کی تحریک ہوئی، تو والد
مرحوم کی تصنیف اور سرمایہ حیات "نزہۃ الخواطر"
کی آٹھ جلدیں ایک سے زائد بار پڑھیں، ان
کتابوں سے ہندوستان کی آٹھ سو برس کی جیتی جاگتی
تاریخ آنکھوں کے سامنے آگئی، علماء و مشائخ
اہل درس و اہل تصنیف، اہل ذوق و اہل کمال
سلاطین و وزراء امراء و روساء کے ایسے حالات
اور ہندوستان کی علمی تاریخ کے ایسے قیمتی نوادر
نکات سوانح میں مل گئے، جن کے لئے سینکڑوں
کتابیں الٹنے اور ہزاروں صفحات کھنگالنے سے
بھی کام نہ چلتا۔ یہ ایک بہت بڑی ثقافت
اور معلومات کا خزانہ تھا، جس کو ہندوستان
کا کوئی طالب علم جو علم سے اپنا انتساب کرتا ہو
نظرانداز نہیں کرسکتا، اور جس کے بغیر آدمی اپنے
ملک ہی میں اندھیرے میں رہیگا، علمی طور پر کسی
کتاب کے مواد اور علمی ذخیرہ سے اتنا استفادہ
نہیں کیا، اور مضامین و تحریروں میں کسی سے اتنا
کام نہیں لیا جتنا "نزہۃ الخواطر" کی ان ضخیم آٹھ
جلدوں کے تاریخی معلومات سے جن کی تلاش
کے لئے تاریخ و تصوف کی کتابوں کے ہزاروں
صفحات دیکھنے کی نہ توفیق تھی نہ فرصت، اور
نہ یہ اندازہ کہ ان کو کہاں تلاش کرنا چاہئے، اور
کس جگہ سے وہ دستیاب ہوسکتے ہیں۔ میری
محرومی کہ میں اپنی کم سنی کی وجہ سے اپنے والد
سے کوئی استفادہ نہ کرسکا، لیکن اللہ ان کو
کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، وہ ایسا
علمی سرمایہ چھوڑ گئے ہیں، کہ ساری عمر اس سے
استفادہ کا موقع ہے۔

زندگی کے طویل تر دور میں دماغ پر علامہ اقبال
مرحوم کا بڑا غلبہ رہا ہے، اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ
کسی معاصر شخصیت کے افکار کا اتنا گہرا اثر دماغ
پر نہیں پڑا، جتنا علامہ اقبالؒ کے کلام کا، غالباً
اسکی وجہ یہ ہے، کہ وہ ان خیالات و تمناؤں
کی ترجمانی کرتے ہیں جو روح و جسم میں پیوست
ہوچکی ہیں۔ اقبال اور ان کے کلام پر اردو میں اتنی
کتابیں شائع ہوئی ہیں جو شاید کسی معاصر شخصیت
اور اس کے فکر پر شائع نہیں ہوتی، لیکن ان میں
سب سے زیادہ پر مغز اور روح پرور کتاب
ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی "روح اقبال" معلوم
ہوئی ——

علامہ مرحوم سے ۱۳۵۶ھ / ۱۹۳۷ء میں دوسری
ملاقات کی، اور کئی گھنٹے ان کے التفات
وارشادات سے محظوظ رہا، جس کا خلاصہ پنجاب
کے ایک رسالہ میں "عارف ہندی کی خدمت
میں چند گھنٹے" کے عنوان سے شائع ہوا،
بلاد عربیہ کے مسلمانوں کی بے اتفاقی، اور ناشناسی
پر دل کھول کر رہتا، اور شکوہ کی قدرافزائی
پر خصہ آتا، علامہ مرحوم کی وفات کے بعد مصر
میں پڑھے جانے کے لئے ایک مفصل و طویل

مضمون علامہ مرحوم کی زندگی و خصوصیات پر لکھا اور بعد میں عالمِ عربی میں ان کے تعارف کی سب سے زیادہ کامیاب کوشش کی توفیق "روائع اقبال"[1] کے ذریعہ ہوئی، جس نے بلادِ عربیہ کے نوجوانوں میں بڑی مقبولیت حاصل کی، ابتدائی استغراق و انہماک کے دور میں تنبیہ ہوئی کہ کسی انسان کے کلام سے اس قدر انہماک اور شیفتگی اچھی نہیں، اصل شغف اور انہماک کی چیز اللہ تعالیٰ کا ابدی پیغام اور کلام ہے جو قرآن مجید کی شکل میں محفوظ ہے، اور جسکو جو کچھ ملا ہے، اُسی سے ملا ہے۔

لیکن اب بھی ان کے اشعار خون میں تموج اور جذبات میں حرکت پیدا کر دیتے ہیں، اور عالمِ اسلام کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے اب بھی اسکو طاقت و خود اعتمادی کا ایک بہت بڑا سرچشمہ سمجھتا ہوں۔

مطالعہ کے سلسلہ میں مولانا عبدالباری صاحب ندوی کی ایک چھوٹی سی کتاب — "مذہب و عقلیات" پر نظر پڑی جو "بقامت کہتر اور بقیمت بہتر" کی صحیح مصداق ہے، ذوق و ذہن نے اسکو پورے طور پر اپنا لیا۔ اس رسالہ سے عقل و نقل کے حدود اور تجربہ و علمِ انسانی کی قاصری، اور کوتاہی و ناپائیداری اور انبیاء علیہم السلام کے علم کی قطعیت کا ایک ابتدائی تخیل حاصل ہوا۔ جو مطالعہ میں بہت کام آیا، اس کے بعد قدیم و جدید فلسفہ، اور اسکی تاریخ پر جو کچھ ہاتھ آیا پڑھا مگر اس ابتدائی تخیل میں ذرا تزلزل واقع نہیں ہوا، بلکہ جس قدر پڑھا "ان ھم الا فی یخرصون — اور بل کذبوا بما لم یحیطوا بعلمہ ولما یاتھم تاویلہ" کی تفسیر و توضیح ہوتی رہی، حافظ ابن تیمیہ کی سورۂ اخلاص" اور "کتاب النبوات" کے اشارات سے مزید مدد ملی، لیکن اس نقش کو پختہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات نے کیا۔

میرے معلّم و مربی میرے برادرِ معظم ڈاکٹر سید عبدالعلی مرحوم، جن کی اصابتِ رائے، خداداد سلامتِ فکر، استقامت، اور گہرا علم زندگی کی ہر منزل، اور ہر موڑ پر میرا دستگیر رہا، برابر حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات، اور حضرت شاہ ولی اللہؒ کی "ازالۃ الخفاء" کے مطالعہ کی تاکید فرماتے رہے، لیکن نو عمری کی سطحیت اور کم سنی کی عجلت کی وجہ سے کبھی دو چار صفحے سے زیادہ نہ پڑھ سکا، دفتر اوّل کا پہلا مکتوب جو حضرت نے اپنے مرشد خواجہ باقی باللہؒ کو لکھا ہے، اور جس میں اپنے بہت سے واردات اور راہِ سلوک کے تجربات لکھے ہیں، ہمیشہ بہت مشکل ثابت ہوا، اور جس طرح بد شوق بچے ہمیشہ قرآن کی تلاوت میں پہلا پارہ

---

[1] حال میں اس کا ترجمہ مولوی شمس تبریز خاں کے قلم سے مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ نے "نقوشِ اقبال" کے نام سے شائع کیا ہے۔

پڑھ کر چھوڑ دیا کرتے تھے لیکن اس مکتوب کے
چند صفحات پڑھ کر کتاب ہاتھ سے رکھ دیا کرتا
تھا لیکن ایک بار اس کا عزم کر لیا کہ مکتوبات کا
لفظ بہ لفظ مطالعہ کروں گا، چاہے بڑا حصہ سمجھ
میں نہ آئے، چنانچہ اس کے چاروں دفتر پڑھے
لفظ بہ لفظ دل لگا کر اور لطف لے لے کر پڑھے
بے استعدادی، قوت مطالعہ کی کمی، اور علوم
عقلیہ و آلیہ کی بے بضاعتی قدم قدم پر دامن گیر
رہی، لیکن ایک عامی کے حصہ میں جو کچھ آیا اس
پر اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ ہے۔

آنچہ ساقی ما ریخت عین الطاف است

اس عرصہ کے بعد حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ
منیریؒ کے مکتوبات کے مطالعہ کی سعادت حاصل
ہوئی، حضرت مجددؒ اور حضرت مخدوم بہاریؒ کے
مکتوبات کے مطالعہ سے علم کا ایک نیا عالم کھلا
کہ سامنے آگیا، وحی و نبوت کی قطعیت، مقام
نبوت و منصب رسالت کی بلندی و برتری
اور خصائص نبوت و انبیاء اور نبوت و ولایت
کے لوازم و مابہ الامتیاز چیزوں کے متعلق جو نکتے
اور حقائق لکھے ہیں، ان پر وقت فکر کے لحاظ
سے یونان و عجم کا پورا فلسفہ سو بار قربان، اور
وجد آفرینی اور کیف آوری کے لحاظ سے شعراء
کے دواوین اور ادب کی بیاضیں ہزار بار نثار،
مکتوبات مجددی کے تذکرہ کے آخر میں سنت
و بدعت کے بارے میں جو مجددانہ کلمات و
تحقیقات قلم سے نکلی ہیں، ان سے بڑا شرح
صدر اور یقین کا اضافہ ہوا، نیز دور اکبری و جہانگیری
میں دین کی نصرت و حمایت کے سلسلہ کے مکتوبات
نے دینی حمیت و غیرت کو بیدار کیا، اور افسردہ
قلب و جسم میں دین کی حرارت پیدا کی، انسانی
تصانیف اور تحریروں میں جن پر زمانہ گذر چکا
ہے، کم چیزوں میں ایسی زندگی اور قلب کی
حرارت دیکھی جتنی ان دونوں حضرات کے
مکتوبات میں پائی جن پر صدیاں گذر چکیں، مگر
وہی زندگی اور تاثیر موجود ہے جو عموماً لکھنے کے
وقت ہوتی ہے۔

میرے محترم دوست اور دینی کاموں میں
رفیق کار مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے
"الفرقان" کا شاہ ولی اللہ بہ حیثیت
مصنف کا عنوان اپنے لئے منتخب کیا، اس
کے لئے ضروری تھا کہ شاہ صاحب کی تصنیفات
پر ایک نظر ڈالی جائے، کچھ پہلے دیکھی تھیں
کچھ نہیں دیکھی تھیں، اس سلسلہ میں "ازالۃ الخفاء"
کے بالاستیعاب پڑھنے کی نوبت آئی، یہ دینی
نکتہ آفرینی کا دوسرا نمونہ تھا، انسانی تصنیفات
میں کم کتابوں سے اتنا متاثر ہوا ہوں گا، جتنا
مکتوبات اور ازالۃ الخفاء سے علم کا چشمہ ابلتا نظر
آتا ہے، آدمی ایک نکتہ کا لطف نہیں لینے پاتا
کہ دوسرا نکتہ سامنے آجاتا ہے۔ اور دوسرے
سے فارغ نہیں ہونے پاتا کہ تیسرا نکتہ سامنے

ترجمے کا ارادہ کیا گر اس بے بضاعت سے بھی فراغت کی کہ ان کی حصہ میں شاہ ولی اللہ

آجاتا ہے، آیات کی تفسیر و تطبیق میں اور خلافت
کے خصائص، نیز دینی انحطاط و تغیر کی تدریجی تاریخ
کی تدوین میں جو کچھ لکھا ہے۔ وہ علمی پختگی کے ساتھ
کیا لطف و لطافت میں ادب و شاعری سے
کم ہے۔؟

حجۃ اللہ البالغہ میں نے مولانا عبید اللہ
صاحب سندھی کے تلمیذ رشید اور پنجاب
کے مشہور عالم و مصلح حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ
سے پڑھی تھی، اور دماغ پر اسکی عقلیت، محکم
استدلال، اور شاہ صاحب کی دلآویزی کا
اثر اس سے قائم ہوا، حجۃ اللہ البالغہ سے علمی و
اصولی مباحث اور متکلمانہ و فلسفہ آمیز دینی
کتابوں کے سمجھنے کی استعداد پیدا ہوئی، اور
اس حیثیت سے اس نے بڑا احسان کیا، یہ کہا
جا سکتا ہے کہ پچھلی صدیوں کی کسی شخصیت سے
ذہن اتنا متاثر اور اسکی تحقیقات سے اتنا متفق
نہیں، جتنا شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کی
کتابوں سے، اگر اپنے فکر و مسلک کے لئے
کسی مکتب خیال کا تعین ضروری ہے، تو میں انہیں
کا نام لے سکتا ہوں، اور درحقیقت ہمارا تعلیمی
و فکری نسب و شجرہ انہیں پر ختم ہوتا ہے۔

شاہ صاحب کے نامور پوتا شاہ
محمد اسماعیل صاحب شہیدؒ کی عقیدت خاندانی
ورثہ ہے، لیکن ان کی شہرۂ آفاق اور مسلم ذکاوت
اور وفور علم کا اندازہ صرف "منصب امامت"
سے ہوا، جو اس موضوع پر میرے محدود علم میں
اپنے طرز کی منفرد تصنیف ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی مختصر تصنیف
"الخیر الکثیر فی اصول التفسیر" (جس کو میں شاہ
صاحب کی علمی بیاض کہتا ہوں) کے بعض علمی
اشاروں اور مختصر نکتوں نے قرآن مجید کے مطالعہ
و تفسیر میں بڑی رہنمائی کی، اور شاہ صاحب
کے بعض مختصر جملوں، اور تھوڑے لفظوں سے
پورے پورے مضامین کے راستے، اور مطالعہ
قرآن میں ذہن کی بہت سی گرہیں کھل گئیں۔

حضرت سید احمد شہیدؒ کے ملفوظات
کے مجموعہ "صراط مستقیم" (مرتبہ مولانا اسماعیل شہیدؒ
مولانا عبد الحیؒ) کو بہت دیر میں دیکھا، مگر تصوف
کے اچھے ذخیرے اور ائمہ تصوف کے ملفوظات
خصوصاً حضرات چشتیہ کے پورے سلسلۂ
ملفوظات کے مطالعہ کے بعد دیکھا، اور معلوم ہوا
کہ تصوف کے لٹریچر میں یہ بالکل ایک انقلابی
کتاب ہے، سلوک راہ نبوت، اور تقرب بالفرائض
کے موضوع کے علاوہ جس کے سید صاحب امام
تھے، اور جو اس عصر کے لئے تزکیۂ نفس، اور
قرب الی اللہ کی سب سے آسان، بے خطر اور
وسیع شاہراہ ہے، طریقت و حقیقت اور
سلوک و تربیت کے متعلق جو نکتے اور حقائق
لکھے ہیں، وہ خداداد ذکاوت، علوم نبوت سے
فطری مناسبت، اعلیٰ روحانیت، اور دقت نظر

کی دلیل ہے، اہلِ ظاہر و باطن اور اہلِ معرفت کے مختلف فیہ مسائل میں جو محاکمہ کیا ہے، اور جو فیصلہ کن باتیں کہی ہیں، وہ ان کی اعلیٰ سلامتِ طبع، دماغی توازن و اعتدال، اور میانہ روی کی شاہد ہیں، کاش! اس کتاب کی شایانِ شان خدمت ہوتی، اور نئے طرز پر مرتب کر کے پیش کی جاتی ــــــ

ان کتابوں کا ایک فیض یہ تھا کہ علوم بحث سے وحشت اور اجنبیت جو منطقی اور صناعی علوم، اور تصنیفات سے پیدا ہو جاتی ہے، وہ دور ہوئی، اس کی بجائے یہ چیز پیدا ہوئی، کہ علمی اصطلاحات اور زمانہ کی زبان کے بغیر بھی علوم و حقائق ادا کئے جا سکتے ہیں، اور کتابوں کے راستے کے علاوہ کچھ اور بھی راستے ہیں، جن سے وہ علوم آتے ہیں جو کتابوں کے صفحات میں مقید نہیں کئے جا سکتے، ایسا بھی ممکن ہے کہ مغز ہو اور چھلکے نہ ہوں، معانی ہوں اور زیادہ الفاظ نہ ہوں، متن ہو اور حواشی نہ ہوں ــــــ

اس عصر کے عارف مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلویؒ (م ۱۳۶۳ھ / ۱۹۴۴ء) سے ملا، قرآن کی باتیں اور اس کے معارف سمجھنے میں نسبتہً سہولت ہوئی، حسنِ الفاظ اور حسنِ ادا کا خیال، زمانہ کی زبان اور علمی اصطلاحات کی تلاش مقصود کے سمجھنے میں حجاب نہ بن سکی، میں نے ایک مرتبہ یہ عرض کیا کہ اگر میں نے حضرت سید احمد شہیدؒ کے حالات نہ لکھے ہوتے، اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات نہ پڑھے ہوتے تو مجھے آپ کی باتوں سے بڑی وحشت ہوتی، مولانا نے اسکو پسند فرمایا، اور دوسروں سے نقل کیا۔

میرے قرآن مجید کے مطالعہ میں مولانا احمد علی صاحب کے مجلس درس کا فیض اور برکت شامل ہے درسی و متداول، اور بعض غیر متداول ضخیم تفسیریں، بعض لفظاً بہ لفظاً دیکھیں، لیکن اصل فائدہ متن قرآن کے سادہ اور بار بار کے پڑھنے سے ہوا، اس سلسلہ میں اس کا اظہار ضروری ہے، کہ قرآن مجید سے اپنا حصہ لینے میں ضروری علمی و لسانی واقفیت کے بعد دو چیزیں سب سے زیادہ مفید ثابت ہوتی ہیں، ایک علومِ نبوت و مزاجِ نبوت سے مناسبت رکھنے والے اشخاص کی صحبت جن کی معاشرت و زندگی کان خلقہ القرآن کا پرتو ہو، اور جنہوں نے انا القرآن الناطق (حضرت علیؓ کا قول) کہنے والے کی قلبی و ذوقی وراثت میں حصہ پایا ہو، ان حضرات کے علوم کی تازگی و شگفتگی، بے آمیزی اور نکھار، اور علم کی وسعت و گہرائی سے قرآن مجید کے الفاظ کی وسعت و عمق کا ایک قیاسی اندازہ ہوتا ہے کئی الفاظ جو "لسان العرب" اور مفردات غریب القرآن سے اور کئی آیات جو زمخشری کی ادبی تفسیر کشاف سے امام رازی کی عقلی تفسیر "فتوح الغیب" اور ابن کثیر کی نقلی تفسیر سے حل نہیں ہوتیں، وہاں باتوں باتوں میں حل ہو جاتی ہیں، الفاظ و معانی میں نئی وسعت

اور قوت نظر آتی ہے جو پہلے نظر سے اوجھل تھی۔

دوسری چیز یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام جن راستوں پر چلے ہیں ان پر چلنے سے قرآن مجید کھلتا ہے، انبیاء علیہم السلام کی جو کیفیات بیان کی گئی ہیں، ان کا احساس ہوتا ہے، قوموں نے اپنے پیغمبروں کو جو جواب دئے ہیں، کان وہی آوازیں سنتے ہیں، اور آنکھیں وہی منظر دیکھتی ہیں، جو اشکالات اور شبہات علم کلام کی کتابوں نے، اور کتابی مطالعہ نے فرضی طریقہ پر پیدا کر دئے ہیں، وہ وہاں بے حقیقت ہو جاتے ہیں، قرآن مجید کے سمجھنے کے یہ دو طبعی طریقے ہیں۔

سنا ہے کہ جب قرآن مجید میں آدمی کا جی لگنے لگتا ہے، تو انسانی تصنیفات سے جی گھبرانے لگتا ہے، انسانی کتابیں، انسانی تحریریں انسانی تقریریں پست اور بے مغز معلوم ہونے لگتی ہیں، ادباء اور حکماء اور مفکرین کی باتیں طفلانہ اور عامیانہ نظر آتی ہیں، جن میں کوئی گہرائی اور پختگی نہیں معلوم ہوتی، سفید کاغذ پر چھپے ہوئے سیاہ نقش و نگار کاغذی پھول معلوم ہوتے ہیں، جن میں رنگ ہے خوشبو نہیں، انسان کا علم ناقص اور خام معلوم ہونے لگتا ہے، اور اس کا دیر تک پڑھنا ذوق اور مزاج پر بار ہوتا ہے، ہر وہ چیز جو علوم نبوت کے سرچشمہ سے نہ آئی ہو، مشتبہ اور الفاظ کا طلسم معلوم ہوتا ہے تسکین صرف وحی و نبوت کے راستے سے آتے ہوئے علم سے ملتی ہے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا تک پہنچایا، اور جو وحی کی زبان میں قرآن مجید میں اور عربی زبان میں حدیث میں محفوظ ہے ؎

دادیم ترا از منزل مقصود نشاں
گر ما نہ رسیدیم شاید تو رسی

★

ماہنامہ الحق پر ایک تازہ تبصرہ

اکوڑہ خٹک ضلع پشاور کی مشہور و معروف دینی درس گاہ "دارالعلوم حقانیہ" جناب شیخ الحدیث مولانا عبدالحق مدظلہ کے زیر اہتمام جو اس کے بانی و مہتمم ہیں، دریائے اٹک کے پار کے تمام علاقوں میں دینی تعلیم کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں وہی خدمات سرانجام دے رہی ہے جو ایک عرصہ دراز تک برصغیر میں دارالعلوم دیوبند دیتا رہا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان اطراف میں قیام پاکستان کے بعد یہ درس گاہ صحیح معنوں میں دارالعلوم دیوبند کی جانشین ثابت ہوئی ہے۔

ماہنامہ الحق اس درسگاہ کا ترجمان ہے۔ اس کے مدیر سمیع الحق صاحب اس قدر شستہ و شگفتہ اردو زبان لکھتے ہیں اور اس ماہنامہ کو اتنی عمدگی اور سلیقہ سے مرتب کرتے ہیں کہ الحق ملک کے چوٹی کے دینی رسالوں میں شمار کیا جا سکتا ہے پیش نظر شمارے میں دینی و سیاسی دونوں انواع کے مضامین ہیں اور نہایت اعلیٰ معیار کے ہیں۔

(امروز - لاہور - ۲۴ فروری ۱۹۷۲ء)

قسط ۲

مولانا سید محمد انظر شاہ صاحب، کشمیری

عظیم اسلامی مملکت کی بربادی کی ذمہ دار

اسلام کی نظر میں

اے صدر محترم ایک نظر اس پر بھی۔ (ایڈیٹر)

زناکاری| اکثر و بیشتر شرابی، حرام کاری کی لعنت کو غیر معمولی طور پر طویل کرنے کے لئے اور بدکاری اور فحاشی میں رنگ رلیاں منانے کے لئے شراب استعمال کرتے ہیں، رندی و مستی میں زنا ایسے مذموم فعل کا ارتکاب یقینی ہے، عقل جو حرام و حلال کی تمیز کرتی تھی جب اس کا گلا گھونٹ دیا گیا، اور انسانی زندگی کے اس سب سے زیادہ مفید جوہر کو مے کشی کے راستے ضائع کر دیا گیا۔ تو پھر حیا سوز افعال میں مبتلا ہونا غیر متوقع نہیں ہے، حرام کاری لازمہ شراب ہے، اور حرام کاری سوسائٹی کے لئے سب سے زیادہ موذی مرض اور بیماری ہے، شہوانی جرائم میں شراب کو کس درجہ دخل ہے۔؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے، بین الاقوامی ادارہ کے صدر ڈاکٹر رابرٹ پیرسن کہتے ہیں کہ:

"قتل اور ڈاکہ کے جرائم اور اجتماعی و انفرادی آلام و مصائب کا سب سے بڑا محرک شراب ہے، شہوانی جرائم ۵۰ سے ۶۰ فیصدی تک شراب نوشی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اور دوسرے جرائم کی تہ میں بھی اکثر شراب نوشی ہی کے اثرات شامل رہتے ہیں۔" (انسانیت حیوانیت کی راہ پر ص ۲۲۳)

زناکار ممالک میں جہاں شراب لازمہ تہذیب قرار دے کر پوری آبادی کو پلائی جا رہی ہے۔ ان زناکار آبادیوں میں ناجائز ولادتیں بکثرت ہو رہی ہیں۔ وسط ۱۹۵۵ء میں برطانیہ کی معاشیاتی ریسرچ کونسل نے جو رپورٹ شائع کی اس میں لکھا ہے کہ:

"ان ناجائز ولادتوں کا تعلق مزید اس کثرت مے نوشی سے ہے جو ۱۰ سال سے کم عمر

والوں اور والیوں میں جاری ہے " (ایضاً)

اس رپورٹ میں ظاہر کیا گیا ہے کہ شراب نوشی کے نتیجہ میں جو بدمستی پیدا ہو رہی ہے، اس میں بڑی اور چھوٹی عمر والے سب برابر شریک ہیں۔ لکھا ہے کہ :

"شراب سے بدمستی جتنی بڑے سن والوں میں ہے، اس سے دگنی ۱۱ سال سے کم عمر والوں میں ہے، شراب سے بدمستی جتنی بڑی سن والیوں میں ہے، اتنی ہی ۱۱ سال سے کم عمر والیوں میں ہے " (ایضاً)

اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ حرام کاری جو نتیجہ ہے، شراب نوشی کا اس سے ناجائز توالد و تناسل میں چھوٹی عمر والی لڑکیاں سب سے بڑھ گئیں۔ لکھا ہے کہ :

"ناجائز ولادتوں کی ۱۱ سال کی عمر والیوں میں ۹ فیصدی کی زیادتی رہی اور ناجائز ولادتوں میں ۱۱ سال سے کم عمر والیوں میں ۲۳ فیصدی کی زیادتی رہی "

بتایا جاتا ہے کہ زنا و حرامکاری جو سوسائٹی کے لئے ایک مہلک روگ اور رستا ہوا ناسور ہے۔ اس کے نتیجہ میں جو ناجائز نسل کشی ہوتی ہے، جن میں پیدا ہونے والے بچوں کی مائیں ۴۱ فیصدی وہ ہیں جو غیر شادی شدہ ہیں جن کو شرابیوں نے رندی و مستی کی بھینٹ چڑھا دیا یا زناکار حالت میں، لڑکیاں سکر و نشہ میں خود ہی شراب نوشوں کی سرگرمی آغوش کے لئے تیار ہو گئیں، وہ بچے جو پیدا ہو رہے ہیں، اپنی حرامکاری کو چھپانے کے لئے یہ مہذب حسینائیں کیا کریں گی ؟!

سوائے اس کے کہ اسقاط حمل کی تیز اور مضر ادویہ استعمال کریں یا معصوم جان کو گلا گھونٹ کر مار ڈالیں یا پھر چلتی گاڑیوں اور راستوں، نالیوں، کھیت اور باغات میں ڈال کر بھاگ جائیں اور کیا کر سکتی ہیں، اور پھر یہ بچے یا مر جائیں، زندہ رہ جائیں تو ان کی پرورش کا بار براہ راست حکومتوں پر آ جائے جسکی وجہ سے ملک کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ اسی مد میں صرف ہو، پھر بھی مشفق ماں و باپ کے نہ ہونے سے تربیت و پرورش، جسمانی صحت، اور نشو و نما میں اس قدر نقص رہ جاتے کہ تمام عمر قوم کے یہ نونہال اپنے لئے اور پورے معاشرہ کے لئے جلائے جان ثابت ہوں، گویا کہ ایک شراب نوشی کا نتیجہ زنا، معصوم بچوں پر ظلم، ان کی معصوم جانوں کا اتلاف، بچوں کی ناقص تربیت، ملک اور سوسائٹی کے لئے اتنی تباہ کن شکل میں ظاہر ہوا اور اسی رندی و مستی کے عالم میں غیر محرم عورتوں اور حسین لڑکیوں پر جنسی میلان کی بے تابی میں بے اختیار نظریں اٹھتی ہیں جس کو مہذب الفاظ میں حسن پرستی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

حسن پرستی اختر شیرانی کے حالات میں ہے کہ

"سینما سے انہیں (اختر شیرانی کو) کوئی خاص لگاؤ نہ تھا، پہلے پہل جب متکلم فلمیں لاہور میں آئیں تو میں انہیں تین چار بار لے گیا، لیکن میں نے دیکھا کہ وہ تصویروں کی بجائے حسین عورتوں کی جانب زیادہ متوجہ رہے جو سینما ہال میں ادھر اُدھر رونق افروز تھیں۔" (نقوش ص...)

حسن پرستی اور دیدہ بازی کا یہ وہی معیوب مشغلہ ہے، جس کی قباحت و شناعت کو ظاہر کرنے کے لئے اسلام نے زنا العین کا عنوان اختیار کیا ہے، زنا کا یہ پہلا زینہ ہے، جس پر سے شیطانی وسوسے غیر شعوری طور پر گزارتے ہیں، اور اسکی انتہا زنا پر ہوتی ہے، شراب نوش عموماً اس خطرناک مرض میں مبتلا پائے جاتے ہیں۔

قوئ شہوانیہ کی تحریک یہ تمام اخلاقی بیماریاں ایک شرابی میں صرف اسی لئے پیدا ہوتی ہیں کہ شراب کا استعمال غیر معمولی طور پر قوئ شہوانیہ میں ہیجان و حرکت پیدا کرتا ہے، جس کے نتیجے میں ضروری ہوتا ہے کہ ہر قوت نفسانی کی محبوب و مرغوب غذا فوراً بہم پہنچائی جائے ورنہ وہ قوت اپنی مطلوبہ غذا کو حاصل نہ کرنے کی صورت میں ایک سخت دھکا کھا کر ماؤف و معطل ہو جاتی ہے۔ شیخ الرئیس بو علی سینا نے شرابیوں کو شراب نوشی کے سلسلہ میں ہدایت دیتے ہوئے لکھا ہے کہ مجلس شراب میں جاذب نظر گل و ریحان، حسین دلفریب نوعمر لڑکے، لطیف اور شہوت بخورات، خوش گو مطرب ہونے چاہئیں، اس لئے کہ:

شراب قوت شہوانیہ کو تحریک دیتی	"وذلک لان الشراب تحریک
ہے۔ لہذا ہر قوت جب اپنی مطلوبہ	قوی النفس ویشیر کل الشہوات
غذا نہ پائے گی تو منقبض ہو جائے گی۔	فاذا لم یجد کل قوۃ مطلوبہا تاذت
....	وانقبضت۔" (نفیس ص...)

اخلاقی زندگی کے سلسلہ میں جن جرائم کا ذکر مختصراً کیا گیا ہے۔ وہ یقیناً شراب نوشی ہی کا نتیجہ ہیں اسلام نے چودہ سو سال قبل جن خطرات کا ادراک کیا تھا آج چودہ سو سال کے بعد دنیا اس کی تصدیق کر رہی ہے، حال ہی میں راجستھان اسمبلی میں انسداد مے نوشی کا بل پیش کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ:

"شراب کو جلد از جلد قانوناً بند کرنا چاہئے مے کشی کے بڑھتے شغل کی وجہ سے اخلاقی جرائم میں غیر معمولی اضافہ ہو رہا ہے۔" (الجمعیۃ۔ دہلی)

ہندوستان کی آبادی میں صرف اسی گوشہ سے ہی یہ آواز نہیں اٹھائی گئی، بلکہ آئے دن صوبوں

کی اسمبلیوں میں اسی قسم کی آوازیں گونج رہی ہیں۔ اور قادیانی مرکزی حکومت کو بھی عنقریب شراب کے استعمال کو روکنے کیلئے کوئی اقدام کرنا پڑے گا۔ اگرچہ آبکاری کے محکموں اور کاروبار سے جو بڑے منافع حکومتوں کو حاصل ہوتے ہیں اس کے پیش نظر انسداد مے نوشی کی موثر جدوجہد تقریباً ناممکن ہے۔

بہرحال اب تک آتش سیال کے ان مضار کی یکسی تفصیل کی گئی جن کا تعلق جسمانی صحت اور پھر اخلاقی زندگی سے تھا۔ اب اس کو بھی دیکھئے کہ ام الخبائث کی تباہ کاریاں معاشرہ سوسائٹی اور عائلی زندگی میں بھی کس درجہ مہلک اور برباد کن ثابت ہو رہی ہیں سینکڑوں گھرانے، قبیلے، خانوادے۔ بیوی بچے عزیز و اقارب اور اس سے بڑھ کر ماحول مے کشی اور بادہ پرستی کی ہلاکتوں سے تباہ حال اور خستہ حال ہے۔ دولت کے انبار جائداد کے طویل و عریض اور زرخیز حصے۔ ملازمت و نوکری سے حاصل ہونے والی رقم اسی جام زہر پہ قربان کی جا رہی ہے۔ گھر میں اہل و عیال بھوک کے تڑپ رہے ہیں۔ معصوم بچے بھوک کی شدت سے بلبلا رہے ہیں۔ لیکن بادہ نوش بوالہوسوں کے بے رحم قلوب پر ان دل ہلا دینے والے مناظر کا کوئی اثر نہیں۔ شاید شراب کا مسلسل استعمال قلب میں قساوت و شقاوت بھی اس درجہ کی پیدا کر دیتا ہے۔ پھر اس جام زہر کا مشغلہ آدمی کو معطل کر کے نشاط کار اور جدوجہد کی امنگ چھین لیتا ہے۔ اور یہ شخص خانگی زندگی کے علاوہ سوسائٹی کے حق میں بھی ایک بڑا بار ثابت ہوتا ہے۔ اس لئے عائلی زندگی اور سوسائٹی کے حق میں شراب کی تباہ کاریوں کے ذیل میں ہم سب سے پہلے فقدان عمل کو لیتے ہیں۔

فقدان عمل ظاہر ہے کہ اس زہر کا طویل استعمال سینکڑوں قسم کی بیماریاں اور عوارض جب پیدا کرتا ہے جس کی تفصیل بیان کی گئی تو صحت جسمانی سے یاس ہونے کے بعد یہ بلانوش تعطل و فقدان عمل کی ایک ایسی زندگی گذاریگا جس میں نشاط کار اور عمل جدوجہد کی امنگ تو درکنار اپنا رو گیلا وجود سنبھالنا اس کے لئے بار ہوگا خاندان اور سوسائٹی کی نظر میں اپنے وجود کو ایک بار کی حیثیت میں دیکھ کر اور ایک رستے ہوئے ناسور کی شکل میں اپنے آپ کو پاکر عجب نہیں کہ یہ آلام و مصائب زندگی کو جلد ختم کرنے کے لئے خودکشی تک پہنچنے کے لئے یہ بلانوش راہ ہموار کرے۔ اگرچہ مے نوشی خود ایک خودکشی ہے جس کی ہلاکت بدیر و سویر موت کی بھیانک شکل میں ظاہر ہو کر رہتی ہے۔ بعض شراب کے پینے والے اس حماقت میں مبتلا ہیں کہ شراب کے پینے سے عمل جدوجہد میں مدد ملتی ہے اور ایک شرابی اس شخص کے مقابلہ میں زیادہ کام کر سکتا ہے۔ جو شراب استعمال نہ کرتا ہو حالانکہ یہ بھی سراسر غلط ہے۔ شراب کے نتیجہ میں عوارض و امراض اور اس کے بعد تعطل و فقدان عمل جو یہی نتیجہ ہے۔ جنوبی افریقہ

ہونے والی جنگ کے دوران افسران فوج نے محاذ جنگ پر کام کرنے والے فوجیوں کے متعلق اپنے مشاہدہ کے بعد رپورٹ دیتے ہوئے لکھا تھا کہ :

"محاذ جنگ پر تھک کر چور چور ہو جانے والے اور جنگ کے عین موقع پر فرار اختیار کرنے والے وہی فوجی سپاہی تھے جو شراب کا استعمال کرتے ہیں" (الخمر والحیاۃ صا۱۹)

اور اس کے ساتھ یہ بھی اطلاع دی گئی تھی کہ :

"اور جو فوجی شراب کے استعمال سے پرہیز کرتے ہیں۔ خطرات کا مقابلہ کرنے والے اور عملی جدوجہد میں ہرگز نہ تھکنے والے وہی ثابت ہوئے :" (ایضاً)

فوجی افسران نے اپنے اس چشم دید تجربے میں یہ بھی بتایا کہ محاذ جنگ پر بے پناہ مصروفیت کے نتیجے میں اگر فوجی بیمار ہو گئے تو تیزی کے ساتھ صحت کی طرف لوٹنے والے وہی تھے جو شراب کے استعمال سے اجتناب کرتے ہیں۔ اور شراب پینے والے، حصول صحت سے بھی محروم رہ جاتے ہیں اپنے اس مشاہدہ کے بعد ان فوجی افسروں نے لکھا تھا کہ :

"انہیں سپاہیوں کی بھرتی کرنی چاہیئے اور محاذ جنگ پر بھیجنا چاہیئے جو شراب کے استعمال سے پرہیز کرتے ہوں اس لئے کہ کارآمد اور فعال سپاہی یہی ثابت ہوئے ہیں ---- .. (ایضاً)

بہترین اور کارآمد فوجیوں کے بارے میں یہ فیصلہ اس یورپ کی جانب سے کیا جا رہا ہے، جسے ایک طویل عرصہ تک فوجیوں کے لئے شراب کو ضروری قرار دیا تھا۔ اور محاذ جنگ پر شراب کے ذخیروں کے ساتھ دنیا بھر سے حرامکار اور بدکار عورتوں کو بھی فوجیوں کی جنسی بھوک کیلئے مہیا کیا جاتا تھا۔ شاید یورپ سمجھ رہا تھا کہ نشہ کی شدت اور جوش میں اپنی جان کو پیش کرنے میں یہ فوجی پس و پیش نہ کریں گے لیکن ماہرین یہ سمجھا رہے ہیں کہ نشہ کے بعد فقدان عمل اور تعطل کا اتنا زبردست مظاہرہ ہوتا ہے جس سے جنگ کے خونریز ہنگاموں کے دوران مقاصد جنگ میں عظیم نقصانات اور ناکامیاں اٹھانا پڑتی ہیں۔ پہلی جنگ عظیم میں یورپ نے بڑی تعداد میں محاذ جنگ میں زناکار عورتوں کا ہجوم اور بڑی تعداد میں شراب کا انتظام کر کے ہر ہر محاذ پر مسلسل شکست اٹھانے کے بعد یہ تجربہ حاصل کیا جس کو چودہ سو سال پہلے اسلام محسوس کر چکا تھا۔ اور بنی نوع انسان کو بھی اس کے خطرات اور ہلاکتوں سے مطلع کر رہا تھا۔ بہرحال معلوم ہوا کہ شراب نشاط کار کو بہیں کرعمل کی امنگ کی بجائے تعطل کا روگ پیدا کرتی ہے۔ اور فقدان عمل کے بعد سے کشی کر کے گھریلو زندگی اور سوسائٹی و ملت تک کو اس ۔ . . .

نقصانات پہنچاتے ہیں، جن کی تلافی ممکن نہیں اس لئے شراب سے ملی جدوجہد میں اعانت و امداد یہ ایک فریب خیال ہے۔

عائلی زندگی کی بربادی! اس کے ساتھ یہ بھی مسلم اور مشاہد ہے کہ ایک شرابی عائلی اور خانگی زندگی کے تقاضوں کو ہرگز پورا نہیں کر سکتا اور مے نوشی کے عوض گھر کی تمام زندگی جہنم زار کا صحیح نمونہ بن جاتی ہے۔ بوتلوں میں بندپانی کے حصول کے لئے بڑی بڑی جائداد اور دولت نثار کر وہ کفاف بھی اسی راستہ ضائع کر دیا جاتا ہے، جو بیوی اور بچوں کے لئے معمولی سی معیشت اور گذران کا باعث بن سکتا تھا۔ یہاں تک کہ بیوی بچے، لباس، خورد و نوش جو کہ انسانی زندگی کے بقا و تحفظ کی بنیادی ضروریات ہیں۔ ان کے انتظام سے بھی عاجز ہو کر رہ جاتے ہیں۔ نتیجۃً یا تو بیوی اور بچوں کو فاقوں کی سخت گرفت میں تڑپ تڑپ کر جان دینا ہوگی یا پھر وہ قرضہ لینے پر مجبور ہوں گے، جسکی ادائیگی بظاہر بالکل ہی ناممکن ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ پیٹ کے جہنم کو پُر کرنے کے لئے ہاتھ پھیلا کر ذلیل و خوار ہوں یا عورت اور لڑکیاں عصمت و عفت کی تجارت اختیار کریں اور لڑکے چوری اور ڈکیتی میں مبتلا ہو کر ملک و سوسائٹی کے لئے ایک مصیبت بن جائیں۔ شراب نوشی کے یہ ہولناک نتائج بالکل یقینی اور مشاہد ہیں۔ وہی سید عبدالحمید عدم پنجاب کے مشہور شاعر جن کا پہلے بھی ذکر گذرا انہیں کے متعلق سوانح میں ہے کہ:

> "ایک دفعہ انہوں نے خود ایک واقعہ سنایا۔ مہینے کی پہلی تاریخ تھی۔ کوئی پانچسو روپیہ تنخواہ لیکر شام کو اختر شیرانی سے ملے اور ایک ہی شام میں پانچسو روپیہ شراب اور عورت کی نظر ہو گئے صبح گھر گئے تو بیوی نے تنخواہ مانگی، کہنے لگے کسی جیب کترے نے کمال صفائی سے جیب کاٹ لی اور ایک پیسہ بھی نہیں چھوڑا۔ بیوی جان گئی کہ جھوٹ ہے۔ لڑائی ہوئی۔" (نقوش ص ۱۱۱)

پانچ سو روپیہ کی ایک خطیر رقم ایک ہی شام کے چند گھنٹوں میں شراب اور عورت کی نذر ہو جانے کے بعد بیوی اور بچوں کو پورا مہینہ جسطرح ایڑیاں رگڑ رگڑ کر گذارنا پڑا ہوگا، اس کا تصور اتنا دلدوز و دلگیر ہے کہ بیان بھی نہیں کیا جا سکتا۔

بیوی بچوں کے تقاضوں اور فقر و فاقہ کے دل دہلا دینے والے مناظر سے بچنے کے لئے سوسائٹی اور عائلی زندگی کے یہ بدترین مجرم پھر یہ کرتے ہیں کہ:

> "گھر کا رخ نہیں کرتے، کئی بار ایسا ہوا کہ ہفتہ ہفتہ میرے گھر پڑے رہے، بڑا لڑکا خالد بار بار آیا اور انہوں نے کہا کہ بیٹا میں آج ضرور آؤں گا۔" (ایضاً)

اور نہ صرف یہ بلکہ شرابیوں کو معیشت کے حصول اور اہل و عیال کی واجبی ضروریات کے تکفل کا خیال تک باقی نہیں رہتا چنانچہ ایک اور مشہور شاعر کے تذکرے میں ہے کہ :

"انہوں نے خود بیوی کی ضروریات معیشت کی جانب کبھی توجہ نہیں کی" (نقوش ص۔۔)

اور پھر یہ بلانوش اپنے بچوں اور متعلقین کو سوسائٹی کے لئے ایک بوجھ بنا کر چھوڑ دیتے ہیں اور بچوں کی صحیح تربیت نہ ہونے کی وجہ سے ان کی بہترین صلاحیتیں ملک وملت کیلئے مفید ہونے کی بجائے مضر اور مہلک ثابت ہوتی ہیں۔ گویا عائلی زندگی کی یہ تباہی براہ راست ملک کے حق میں بھی ضرررساں بن جاتی ہے۔ کیونکہ :

"گھر ہی سب سے پہلی تربیت گاہ تھی جس میں بچے اور بچیاں صحیح تربیت کے سانچوں میں ڈھلکر ملک وملت کے لئے باعث فخر اور امتیاز وافتخار کے لائق مفید کردار ادا کر سکتے تھے" (الخمر والحیوٰۃ ص۹)

لیکن عائلی زندگی کی تباہی سے ملک کی یہ متوقع گراں بہا دولت برباد ہو جاتی ہے اور خطرہ شدید اس کا بھی ہے کہ پینے والے باپ کے عادات وخصائل خدانخواستہ معصوم بچوں میں اگر سرایت کر جائیں جس کا امکان بہت زیادہ ہے۔ تو ایک اتنی بڑی تباہی آئے گی، جس کا ازالہ بھی ہمیشہ کے لئے ناممکن ہوگا۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ بچے بھی مے کشی کی ناہنجار عادت میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اگرچہ یہ بھی بالکل متوقع ہے، بلکہ اس وقت عالم انسانی عادات وخصوصیات کے بارے میں عرض کر رہا ہوں جن کے لحاظ ہی سے انسان حیوان سے ممتاز ہو سکتا ہے۔ شرابی عام انسانی امتیازات کے برعکس جن حیوانی عادات کا خوگر ہو جاتا ہے۔ اس کا اندازہ اس اقتباس سے کیجئے۔

"اسی وارفتگی کے سبب وہ کئی کئی روز تک نہیں نہاتے۔ اور پھر لطف یہ کہ انہیں اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ سردیوں میں خاص طور پر وہ ایک ایک قمیض کئی کئی دن پہنے رہتے ہیں۔ ان کے کوٹ اور پتلون کی تہ اکثر خراب ہوتی ہے کپڑے اکثر ان کے جسم پر لٹکے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ بعض اوقات وہ کئی کئی دن تک منہ بھی نہیں دھوتے۔ صبح اٹھے اور کالج اور دفتر چلے گئے" (نقوش شخصیات نمبر ص۱۱۳۱)

بھلا سوچنے کی بات ہے کہ تربیت کا وہ سب سے پہلا سکول اور آنکھ کھولنے کے بعد وہ سب سے پہلا ماحول جس میں بچہ سب سے زیادہ قریب ماں اور باپ ہی ہوتے ہیں۔ اور جن کے عادات و اخلاق، خصائل وکردار سے بچہ غیر شعوری طور پر متاثر ہوتا ہے۔ اس ماحول میں جب اسے ماں اور باپ

ہی سے یہ سبق ملے گا۔ تو اس کی بدتمیزیاں کہاں تک نہ پہنچیں گی۔ انسانیت سے نکال کر حیوانیت اور چوپایوں کی زندگی میں داخل کرنے کا یہ سبق جو بچوں کو دیا جاتا ہے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ملک و قوم کے ان مجرموں کے اس شدید نوعیت والے جرم کی تعبیر کس عنوان سے کی جائے۔

معاشرہ کی تباہی :- مے کشی کے بڑھتے ہوئے شغل کا نتیجہ انسان کی انفرادی و عائلی زندگی پر یہ ناگوار اثرات چھوڑتے ہوئے پھر جس طرح اجتماعی زندگی کے لئے تباہ کن بنتا ہے۔ اسکی تفصیل بھی بڑی ہولناک ہے اس کو سمجھنے کے لئے ذرا ان اعداد و شمار پر نظر ڈالئے جو آئے دن مؤقر اخبارات اور انسداد منشی کی سوسائٹیوں کی جانب سے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اطلاع دی گئی تھی کہ :

"بلجیم ایک چھوٹا سا ملک ہے، جس کی آبادی ۸½ ملین سے زائد نہیں لیکن ایک لاکھ نو ہزار شراب خانے ملک میں موجود ہیں۔ یعنی ہر ۴۰ اشخاص کے لئے جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل ہیں، ایک شراب خانہ ہے۔ گذشتہ نصف صدی میں بلجیم کی آبادی میں فی صدی پچاس کی ترقی ہوئی لیکن شراب خانے فیصدہ ۲۰۰ زیادہ ہوئے"

اور اس کے بعد لکھا ہے کہ :

"اہل بلجیم ایک سال میں ۵۵ گیلن شراب پیتے ہیں اور مجموعی مقدار دو کروڑ دس لاکھ چالیس ہزار پونڈ شراب میں صرف کرتے ہیں، یعنی روزانہ ستاون ہزار چھ سو پونڈ کی شراب خرچ ہوتی ہے۔ فی کس ۲½ پونڈ اور فی خاندان پندرہ پونڈ کا سالانہ حساب بار ... ط ہے :" (حکام المنظمہ ص ۲۵۵)

(باقی آئندہ)

قادیانی تبلیغ کی حقیقت

جناب شاہد تنویر صاحب، ایم اے

مبلغوں کے روپ میں استعماری طاقتوں کی حاشیہ نشینی

قادیانیوں کی بیرون ممالک تبلیغ کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ یہ لوگ سامراجی طاقتوں کے آلۂ کار کے طور پر ان ممالک میں استعماری مفادات کا تحفظ کرتے ہیں۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ لوگ چاہے بالکل معمولی کام ہی کیوں نہ کر رہے ہوں، اپنے مراکز کو مبالغہ آمیز رپورٹیں روانہ کرتے ہیں۔ ان نام نہاد تبلیغی کارگزاریوں کی بنا پر لاہور اور ربوہ کی جماعتیں سادہ لوح مرزائیوں سے چندہ بٹورتی ہیں۔ مشہور مرزائی مبلغ جماعت لاہور مولوی عبدالحق ودیارتھی نے ۱۹۵۵ء میں جنوبی امریکہ کا دوسرا تبلیغی دورہ کیا۔ ڈچ گیانا میں ان کی مڈبھیڑ قادیانی مبلغ سے ہوئی۔ آپ قادیانی تبلیغ کی حقیقت بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> "یار لوگ بخیر قصر خلافت قادیان کے کنگروں تک بھی ہماری جماعت ڈچ گیانا کی کامیابی کی خبریں پہنچیں۔ حضرت مسیح موعود کی قبر کے مجاور کب گوارا کر سکتے تھے کہ کسی جگہ جماعت احمدیہ پیدا ہو اور وہ خانہ ساز آستانۂ خلافت پر درود و فاتحہ کا چڑھاوا اور نذرانہ وظیفہ پیش نہ کرے۔ چنانچہ خبروں کے پہنچتے ہی ان کے پیٹ میں قراقر اور نفخ کی ہوائیں زور و شور سے اٹھنے لگیں اور ڈچ گیانا میں مبلغ بھیجنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ پہلے ہالینڈ میں مولوی غلام احمد بشیر کو ڈچ گیانا کا پاسپورٹ اور ویزا حاصل کرنے کیلئے لکھا گیا۔ جب اس میں کامیابی نہ ہوئی تو ظفر اللہ خاں کو تار دی گئی اور یوں مبلغ وہاں بھیجنے کی منظوری حاصل کی گئی۔ (قادیانی مبلغ نے) اپنی صداقت کی سب سے بڑی دلیل یہ دی کہ ہماری جماعت بہت امیر ہے اور ہم تین لاکھ روپیہ صرف کر سکتے ہیں سکول کالج کھولیں گے اور معقول تنخواہیں دیں گے۔ بچوں کو مفت تعلیم دیں گے تھیں

لاکھ روپیہ کا لالچ سن کر چند ایک لالچی بندے سنتے بڑے متاثر کے ساتھ ہو گئے یا یوں سمجھیے چند لالچی مکھیاں بھوکی مکڑیوں کے فریب میں پھنس گئیں یہاں چند کا چندہ سو بنا کر پیش کرنا کونسا مشکل کام تھا جس طرح ۲ لاکھ روپیہ کی جھنکار ایک دھوکہ اور فریب تھی اسی طرح ربوہ کے گذشتہ سالانہ جلسہ پر چار سو آدمیوں کا آستانہ خلافت کو بوسہ دینا۔ رشید شاہی جھوٹ تھا۔ اور مقصد یہاں کی جماعت سے چندہ بٹورنا تھا۔[1]

آگے چل کر مولوی ودیارتھی لکھتے ہیں:

"کیا پوچھتے ہیں آپ اس خوشی کا حبیب ربوہ میں کانوں سے یہ خبر پہنچی ہوگی کہ ہمارے سات سکول سورینام میں کھل گئے، کتنی بڑی کامیابی کا یہ ثبوت ہے۔ لاؤ مرید و چندہ کہ اتنے سکول چلانے کے لئے لاکھوں روپیہ کی ضرورت ہے اور یہ کرامت خلافت حقہ کا بین ثبوت ہے اس کی حقیقت صرف یہ ہے کہ مبلغ صاحب مختلف لوگوں کے گھروں پر جا کر دستک دیتے کہ ہم آپ کے بچوں کو قاعدہ اور نماز مفت پڑھائینگے تو کوئی حقیقت ناشناس ان کو کہہ دیتا کہ بہت اچھا آپ ہمارے برآمدہ میں بیٹھ کر دو بچوں کو پڑھایا کریں۔ تو یہ سکول نمبر ۱ کی عظیم الشان عمارت کھڑی ہو گئی، کسی کے مکان پر آنسہ فلاں جی کو کہا بہت اچھا ہم محلہ کے بچوں کو کہیں گے کہ وہ ہفتہ میں ایک دن آدھ گھنٹہ کے لئے یہاں آ جایا کریں گے ایک مکان کے زیر زمین مرغی خانہ کے پہلو میں یہ عظیم الشان ہائی سکول نمبر ۲ کا نام پاتا تھا، کبھی کسی دن کچھ لوگوں کو چائے کی دعوت کا لالچ دے کر بلاتے تو ان کا فوٹو لے کر ربوہ بھیج دیتے کہ یہ لوگ سورینام میں بیٹھے بیٹھے ربوہ کے آستانہ خلافت کو بوسہ دے رہے ہیں قادیان اور ربوہ میں یہ حرکات بہت پرانی ہو چکی ہیں مجھے یاد ہے کہ قادیانی عرف ابو البرکات صاحب اول کوزال دہلی میں رہتے تھے، انہوں نے ایک بہت بڑا بورڈ اپنی بیٹھک پر لگا دیا "اشاعت اسلام کالج کھل گیا" کالج کی افتتاح کے دن دہلی کے روساء کو ایک کمرہ میں دعوت دی اور دوسرے کمرے میں قادیانی جماعت کے چیدہ چیدہ لوگوں کو لا بٹھایا کہ اس مبارک تقریب پر تلاوت قرآن مجید کریں۔ مولوی عمر الدین صاحب مرحوم کو درس دینے پر مقرر کیا

---

[1] روح اسلام لاہور جلد ۲ نمبر ۱۲، دسمبر ۱۹۵۷ء صفحہ

ادھر رؤساء کو یہ کہا کہ سب لوگ (یعنی قادیانی) اشاعت اسلام کالج کے طلباء ہیں ان کے اخراجات کالج برداشت کرے گا۔ پہلے سے ایک اپیل چندہ لکھ رکھی تھی اس پر رؤساء کے دستخط لے لئے کہ ہم نے کالج کا معائنہ کیا۔ طلبہ کافی تعداد میں تھے اور پڑھائی باقاعدہ اور اعلیٰ ہو رہی تھی۔ چنانچہ کالج کے بانی صاحب نے قادیانی اور رؤساء دہلی دونوں کو خوب الّو بنایا اور چندہ کر کے لے گئے۔ بعینہٖ یہی روش ڈنڈی کانا کے مبلغ صاحب نے خلیفہ ربوہ کی جوتیوں کی طفیل اختیار کر رکھی ہے۔ اگر ہمیں کہتے تو ہم ان کے لئے ایک اور کالج کا اضافہ کر دیتے، جس میں صدر صاحب جماعت سورینام معہ اپنے مقامی مبلغ کے وہسکی اڑاتے اور زیادہ سے زیادہ پینے کی مشق کرتے۔" ۱؎

"جماعت ربوہ کا کیلا کالج" کے عنوان سے دیار حق صاحب لکھتے ہیں:

"تازہ خبر یہ ہے کہ مبلغ صاحب ربوہ کو اسی جگہ شادی کر کے اپنے بیوی اور پیدا ہونے والے بچوں کا کالج کھولنے کی اجازت مل گئی ہے۔ مگر اس سے پہلے ایک بڑھیا کالج ربوہی مبلغ نے ٹرینیڈاڈ میں کھول رکھا ہے، جس میں مولوی محمد اسحاق ساقی ماسٹر آف عربک اور ان کی اہلیہ محترمہ یعنی پرنسپل اور پروفیسر دونوں نے کیلے کی زراعت کا کالج کھول کر ان کی تعلیم و تربیت میں بے حد کوشاں ہیں، شاید یہ تمام ساقی کی رعایت سے کیلے میں پینے پلانے کی کوئی چیز دریافت کرنے میں کامیاب ہو جائیں یہ ہے۔ ربوہی تبلیغ کا نمونہ اور کچا چٹھا کہ جس کا ڈھنڈورا پیٹ کر پاکستان کے سادہ لوح مریدوں سے چندہ بٹورا جاتا اور جائیدادیں وقف کرنے کی اپیلیں کر کے مرحوم و مغفور مقبرہ بہشتی کی بجائے ربوہ کے مشہد بازار میں قبروں کی زمین حاصل کی جاتی ہے۔ سنا ہے خلیفہ صاحب کی برکت سے قادیان کے کل مقدس مقامات جو مجاوروں نے آمد کا ذریعہ بنا رکھے تھے۔ انڈین گورنمنٹ نے اویکوئی پراپرٹی قرار دے کر ضبط کر لئے ہیں اور ڈھائی لاکھ روپیہ کرایا طلب کیا ہے۔ سالانہ جلسہ کے موقعہ پر یہ خوشخبری بھی جماعت کی برکات خلافت میں شمار ہونی چاہئے۔" ۲؎

۱؎ روزنامہ اسلام لاہور دسمبر ۱۹۵۰ء۔ ۲؎ ایضاً

یہ تو قادیانی مشنوں کے بارے میں رپورٹ تھی۔ اب ذرا لاہوری مرزائیوں کی کارگزاری سنیئے! یہی مرزائی مبلغ اپنی جماعت کے بارے میں لکھتا ہے:

"اخبار میں موٹی سرخی دی جاتی ہے کہ فلاں ملک میں ہمارا مشن کھل گیا۔ اور مبلغ کو دیگر اخراجات تو ایک طرف سالہا سال تک تنخواہیں نہیں ملتیں۔ یہ حال ہے لٹرکی مشن کا، برلن کے امام ہوبہوم کا تار میں نے خود دوکنگ میں پڑھا کہ میری بیوی کے ہاں بچہ ہونے والا ہے۔ میرے پاس ایک پائی نہیں خدا کے لئے مجھے کچھ بھیجو۔ اس کا انجام جو کچھ ہوا وہ آپ کے سامنے ہے۔ وہ مبلغ احمدیوں کا دشمن ہو گیا اور آپ کا لکھو کھا روپیہ برباد ہو گیا۔ مرکز کے اس سلوک کرنے سے تمام مشنوں کا بیڑہ غرق ہو کر رہ گیا۔ بڑی محنت سے بنائی ہوئی جماعتیں ختم ہو گئیں اس کا ماتم انڈونیشیا کا برباد مشن کر رہا ہے۔ آنے والی نسلیں ان آثار قدیمہ کو دیکھ کر مرکز کے کرتا دھرتا لوگوں کی نالائقی پر آنسو بہائیں گی کہ یہاں احمدیہ انجمن اشاعت اسلام کا مشن ہوا کرتا تھا۔ کیا یہ تبلیغ اسلام کا دعویٰ کرنے والی جماعت کے لئے مقام ذلت نہیں کہ وہ اپنی سالانہ رپورٹ میں ان مشنوں کی کامیابی کا ڈھنڈورا پیٹتی رہے۔ جن کا دنیا میں کوئی وجود ہی نہیں، اور جماعت کو دھوکہ دے کر چندے وصول کرتی رہے۔"[1]

مولوی دیانت علی نے ایک مضمون میں اپنی جماعت مرزائیہ کے جمود اور قادیانی جماعت کی کاروائیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر کیا:

"امریکہ انگلینڈ اور بعض اسلامی ممالک کا دورہ کرنے کے بعد مجھے اس امر کا شدید احساس ہوا کہ حضرت مولانا محمد علی صاحب مرحوم و مغفور کے بعد ہر جگہ ہماری جماعت میں جمود نمایاں ہے۔ بعض جگہ جہاں ہمارے تبلیغ و اشاعت اسلام کے زبردست مشن تھے، قابل مشنری نہ ہونے کی وجہ سے بند ہو گئے، جہاں ہماری بڑی بڑی جماعتیں تھیں مرکز سے ان کی خبرگیری نہ ہونے کی وجہ سے جماعت ربوہ کو یہ موقعہ مل گیا کہ وہ ہماری بنی بنائی جماعتوں کو اپنے گلے میں ملالیں۔ ہیلی، ٹرینیڈاڈ،

---

[1] الفضل ربوہ مورخہ ۱۹ ستمبر ۱۹۵۷ء

انڈونیشیا، سیلون اور مدراس وغیرہ ہندوستان کے شہر ایسے مقامات ہیں جن کے متعلق مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ وہاں کی جماعتیں کلیم یا قریباً ختم ہو کر ربوہی مبلغین کا شکار ہو چکی ہیں۔ ربوہ کی جماعت کے لئے یہ ایک نہایت افسوس ناک سودا ہے کہ وہ جہاں کہیں ہماری جماعت کی خبر پاتے ہیں۔ اس جگہ اپنے مبلغ بھیج کر جماعت کے افراد کو روپیہ پیسہ کا لالچ دلا کر غلط فہمیاں پھیلا کر اور افترا پردازیاں کر کے ورغلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ۱۹۵۶ء و ۱۹۵۷ء میں مجھے ڈچ گائنا میں ان کے مبلغین سے مقابلہ پیش آیا۔ ان کے اندر تبلیغ اسلام کی کوئی اہلیت نہیں صداقت اسلام اور حقانیت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم پر بولنے کی ان میں کوئی قابلیت نہیں غیر مذاہب کے متعلق ان کی معلومات سطحی ہیں ان کو صرف ایک سبق بیس برس تک رٹایا جاتا ہے۔ (کیونکہ میاں محمود احمد صاحب نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ہمارے ہاں مبلغ بیس برس میں تیار ہوتا ہے) جو سبق ان کو رٹایا جاتا ہے۔ اس کی ۵ فصلیں ہیں فصل اول کا عنوان ہے۔ مولانا محمد علی صاحب قادیان سے قرآن چرا کر لے گئے دوسری فصل کی سرخی ہے مولانا محمد علی انتخاب خلافت میں ہار گئے۔ تیسری فصل کا موٹا سرنامہ یہ ہے کہ خواجہ کمال الدین (معاذ اللہ) منافق تھے۔ چوتھا سبق ہے۔ ہماری جماعت بہت امیر ہے۔ ہم تین لاکھ روپیہ لے کر آئے ہیں۔ پانچویں خوشخبری یہ ہے کہ لوگوں کے بچوں کو ان کے گھروں میں جا کر دینیات (جو سراسر گمراہی کا دوسرا نام ہے) کی تعلیم مفت دیں گے۔ پانچ ارکان اسلام کے بالمقابل ربوہی جماعت کے یہ پانچ اصول تبلیغ ہیں اور قبلہ اسلام کی طرف لوگوں کو جھکانے کی بجائے آستانہ خلافت پر لوگوں کو گرانا ان کی تبلیغ کا انتہائی گُر ہے۔[1]

یہ ۔۔۔ وہ قادیانی تبلیغ جس کا مرزائی ڈھنڈورا پیٹتے نہیں تھکتے اور اپنی جماعتوں سے لاکھوں روپیہ چندوں کے ۔۔ ذریعے بٹورتے ہیں۔ اس مقام پر قادیانیوں کی تبلیغ کی علت غائی کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے۔ نام نہاد تبلیغ اسلام کی حقیقی غرض و غایت کو مشہور مرزائی فریق لاہور ڈاکٹر بشارت احمد نے بڑی خوش اسلوبی سے آشکار کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"گورنمنٹ سے اندر خانے خفیہ ساز باز کی اگر عادت ہو گی تو جناب میاں صاحب

---

[1] ماہ رسالہ پیغام اسلام لاہور جلد ۳ عدد ۱۱ بابت ماہ نومبر ۱۹۵۷ء صفحہ ۵

(مرزا بشیر الدین) کو ہوگی جنہوں نے بقول خود گورنمنٹ کی خاطر کانگریس کے مٹانے پر قوم کا لاکھوں روپیہ صرف کر دیا۔ یہاں تک کہ میاں صاحب کے قول کے بموجب جب وقت گورنمنٹ کے افسر اپنے گھروں میں آرام کیا کرتے تھے اس وقت بھی میاں صاحب کے مرید گورنمنٹ کا یہی خفیہ کام کیا کرتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کے اکثر ممالک میں یہ قادیانی لوگ جاسوس سمجھے جانے لگے۔ خواجہ کمال الدین مرحوم فرماتے تھے کہ جس ملک میں میں گیا، وہاں کے لوگوں کو یہی کہتے سنا کہ یہ قادیانی لوگ گورنمنٹ کے خفیہ جاسوس ہیں یہ بات غلط ہو یا صحیح ہو مگر لوگوں کے قلوب پر یہ بداثر کیوں پڑا اسی لئے کہ میاں صاحب گورنمنٹ کی خاطر ایسی خفیہ کارروائیاں کیا کرتے تھے، جن کا انہوں نے خود اپنی تقریر میں اعتراف کیا ہے۔[1]

امت مرزائیہ کا یہ کردار برطانوی سامراج کے عہد تک ہی محدود نہیں تھا، آج بھی قادیانی سامراجی طاقتوں کے اشارے پر اسلامی اقدار اور مسلمانوں کی سیاسی بالادستی کے خلاف مصروف عمل ہیں۔ نازیوں اور صیہونیوں کی طرح ان کا ایک اپنا طریق کار اور لائحہ عمل ہے، جس کے مطابق یہ دنیا میں کام کرتے ہیں، اور مبلغوں کے روپ میں مختلف ممالک میں گھس کر استعماری طاقتوں کی ذیل حاشیہ نشینی کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔

■■

---

[1] مرآۃ الاختلاف، ڈاکٹر بشارت احمد مرزائی فریق لاہور، مسلم پرنٹنگ پریس لاہور، بار اول ۱۹۳۸ء صـ ۹۲

ناظم دفتر اہتمام

احوال و کوائف

دارالعلوم

نئے گورنر صاحب کی آمد | سرحد کے نئے گورنر جناب ارباب سکندر خان خلیل کراچی میں حلف وفاداری اٹھانے کے بعد دوسرے دن پشاور جاتے ہوئے دارالعلوم تشریف لائے۔ دارالعلوم حقانیہ میں اچانک آمد کے موقع پر دارالعلوم کے صحن میں استقبالیہ اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آج ہم پر بہت بڑی ذمہ داری عائد ہو چکی ہے۔ اور اللہ نے ہمیں ایک بڑی آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ انہوں نے حضرت مولانا عبدالحق صاحب شیخ الحدیث اور حاضرین سے دعا کی درخواست کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ سب اللہ سے دعا مانگیں کہ وہ ہمیں اس ملک کے تمام مسائل کے بہترین حل کی توفیق دے اور ہم نہ صرف مزدور کسان اور پسماندہ طبقہ کی صحیح خدمت کر سکیں بلکہ جسطرح ہمارے بہت بزرگ رہنما مولانا عبدالحق صاحب نے یہاں اسلام کی شمع روشن کی ہے۔ اس طرح پورے صوبہ میں اسلام کا بول بالا کر سکیں اور ایسے دارالعلوم جگہ جگہ بنا سکیں۔ اس موقعہ پر قائد جمعیۃ حضرت مولانا مفتی محمود صاحب مدظلہ بھی موجود تھے۔ حضرت شیخ الحدیث نے حاضرین کے ساتھ ہر دو حضرات کو نئی ذمہ داریاں سنبھالنے کی دعا کی۔ دعا کے دوران حضرت گورنر صاحب احساس ذمہ داری سے آبدیدہ تھے۔ شیخ الحدیث صاحب نے فرمایا کہ انشاء اللہ اسلام کی روشنی میں گورنر صاحب اور مفتی صاحب اس ملک کو ایک مثالی ریاست بنا سکیں گے۔ گورنر صاحب کی آمد پر ہزاروں افراد، طلبہ و اساتذہ اور شیخ الحدیث مدظلہ نے دعا کی۔ موصوف کے ساتھ بیشمار حکام اور معززین بھی دارالعلوم تک جو استقبالیہ جلوس میں شامل تھے۔

حضرت شیخ الحدیث کی مصروفیات | حضرت شیخ الحدیث مدظلہ ۱ر اپریل کو حضرت مولانا مفتی محمود صاحب مدظلہ کی معیت میں راولپنڈی تشریف لے گئے۔ جہاں اس دن حضرت مفتی صاحب کے ساتھ پریذیڈنٹ ہاؤس میں جناب صدر پاکستان کے ساتھ پارلیمانی لیڈروں کے مذاکرات میں شرکت کی دوسرے دن اسمبلی کے اجلاس کے سلسلہ میں گورنمنٹ ہاسٹل اسلام آباد منتقل ہوگئے۔

باقی صـ۳۹ پر